وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا
(البقرۃ: ۲۶۹)

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۴۲ شمارہ ۳

محرم الحرام۔ ربیع الاوّل ۱۴۴۵ھ جولائی۔ ستمبر ۲۰۲۳ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہما

مدیر مسؤول: ڈاکٹر عارف رشید

مدیر:
ڈاکٹر ابصار احمد

نائب مُدیر:
حافظ خالد محمود خضر

مجلس ادارت:
حافظ عاکف سعید۔ حافظ عاطف وحید
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ۔ مؤمن محمود
پروفیسر حافظ قاسم رضوان

یکے از مطبوعات
مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور

36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور۔فون 3-35869501

ویب سائٹ : www.tanzeem.org

ای میل: publications@tanzeem.org

سالانہ زرِتعاون : 500 روپے، فی شمارہ : 125 روپے

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

ماہمہ افسونیٔ تہذیبِ غرب	ڈاکٹر ابصار احمد	3

دعوت رجوع الی القرآن

تذکرہ مرکزی انجمن خُدّام القرآن	ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن	11

قرآنیات

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے منہجِ تفسیر میں نظمِ قرآن کی اہمیت اور استعمالات	ڈاکٹر صاحبزادہ باز محمد/عبدالسلام	25

تذکّر و تدبّر

مِلاکُ التأویل (۳۳)	ابوجعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی	41

فہم القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح	پروفیسر حافظ احمد یارؒ	56

فکر و نظر

روایتی علم النفس اور جدید نفسیات	مکرم محمود	65

تعلیم و تعلّم

مباحثِ عقیدہ (۱۴)	مؤمن محمود	70

کتاب نما

تعارف وتبصرہ	ادارہ	83

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ما ہمہ افسونئ تہذیبِ غرب☆

ڈاکٹر ابصار احمد

مؤسس انجمن خدام القرآن لاہور و بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے ۱۹۶۷ء میں شائع شدہ اپنی ایک اہم تحریر بعنوان ''اسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' میں دس بارہ ذیلی عنوانات میں سے ان دو پر بھی اپنے خیالات پیش کیے ہیں:

i) فکرِ مغرب کا ہمہ گیر استیلاء

ii) عالَمِ اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش

مغرب اور مغربی اقوام ہی فی الحقیقت وہ علاقے اور ان میں بسنے والی اقوام ہیں جنہیں حدیث مبارکہ میں ''روم'' اور ''بنی الاصفر'' (white-skinned nations) کہا گیا ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں ملّتِ روم کی مختلف شاخوں یعنی یورپین اقوام نے تقریباً تمام اسلامی مملکتوں کو اپنی نوآبادیاں بنا کر نہ صرف ان کے مادی وسائل پر قبضہ کیا اور ان کے تہذیب و تمدن، دین، دینی روایات اور زبانوں کو مسخ کیا بلکہ ان پر جدیدیت اور مادی فلسفیانہ افکار بھی مسلّط کیے۔ ''روم'' (نام نہاد عیسائی یورپ اور ایک حدیث میں وارد ملّتِ روم کے متعدد ''سینگوں'' میں سے آخری سینگ ریاست ہائے متحدہ امریکہ) دراصل اسی عالم جبر اور اسی ملّتِ الحاد کا تسلسل ہے جسے ہم عصرِ حاضر میں مجموعی طور پر ''مغرب'' کے نام سے بیان کرتے ہیں۔

گلوبل سطح پر گزشتہ چھ ساڑھے چھ دہائیوں کے دوران الحادی و مادی طرزِ فکر اور زاویۂ نگاہ نے بہت سے چولے بدلے ہیں۔ پوسٹ ماڈرن لبرل/ سیکولر فکر نے ہیومن ازم، کیپیٹل ازم، امپیریل ازم وغیرہ اور ان پر مبنی اس کے پیراڈائم میں نمو پانے والے سارے علوم نہ صرف کفر و الحاد کا زہر اپنے اندر رکھتے ہیں بلکہ مغربی فلسفیوں اور دانش وَروں کے بقول انسانیت کے لیے تباہ کن بھی ہیں۔ جرمن فلسفی ہائیڈیگر، ناسا کا چیف سائنٹسٹ ڈاکٹر سائمن رامو، ہزرل (Husserl)، امریکی نفسیات دان اور سوشل نقاد ایرک فروم (Erich Fromm)، ہربرٹ مارکوزے، اڈورنو (Adorno) اور ریاک ہائمر کی اہم کتاب The Dialectic of Enlightenment کا

☆ ترجمہ: ''ہم سب تہذیبِ مغرب کے سحر زدہ ہیں۔''

مطالعہ مغرب کے فلسفۂ روشن خیالی کو خرافات قرار دیتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جدید انسان نے مذہب کی زنجیروں سے نکل کر سائنس وٹیکنالوجی کے مذہب کو اپنا لیا ہے‘ جس سے اس کا نکلنا اب محال ہے۔ پوسٹ ٹروتھ دور میں مطلقیت اور آفاقیت بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں اور ان کی جگہ انسانیت‘ بے معنویت‘ بے مقصدیت (Nihilism)‘ بے اطمینانی‘ بددلی اور بے زاری انسان کا مقدر بن گئے ہیں۔ امریکی فلسفی ایڈم کرش (Adam Kirsch) کی کتاب The Revolt Against Humanity: Imagining a Future Without Us کے مشمولات اس ضمن میں ازحد فکر انگیز اور چشم کشا ہیں۔

متذکرہ بالا کتاب حال ہی میں امریکہ کی اہم یونیورسٹی کولمبیا کی Columbia Global Reports سیریز میں اسی سال (۲۰۲۳ء میں) شائع ہوئی ہے۔ اس کا سرعنوان اور سب ٹائٹل دونوں ہی چونکا دینے والے ہیں: ’’انسانیت کے خلاف بغاوت اور ہمارے (یعنی انسان کے) بغیر مستقبل کی دنیا کا تصور۔‘‘ یورپ میں سترھویں صدی سے شروع ہونے والی تحریکوں نے قرونِ وسطیٰ کے افکار کو چیلنج کرتے ہوئے انسان کو مطالعات اور سوچ بچار میں مرکزی مقام دلایا‘ یہاں تک کہ ایک پوری فکری تحریک کو ہیومن ازم کہا گیا جس میں انسان کو خدا کی جگہ لا بٹھایا گیا۔ علوم کی نشاۃ ثانیہ‘ تحریک تنویر‘ مذہبی ریفارمیشن اور فرد کی آزادی (Liberalism) کی تحریکیں اسی سلسلے کی کڑیوں کے طور پر سامنے آئیں۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ گزشتہ سو سال کے دوران مغرب میں لبرل ازم اور ہیومن ازم کی تنقید میں کثیر تعداد میں مفکّرین کی ایسی تحریریں بھی سامنے آئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف سوڈیڑھ سو سال میں کلائمکس پر پہنچ کر ہیومن ازم کا بخار اتر گیا اور اس کا bubble برسٹ ہو رہا ہے۔ اکیڈیمیا اور تعلیم یافتہ لوگ ایک گہرے sense of crisis کے اعصاب شکن تجربے سے گزر رہے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب اس بات کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہے کہ جب انسان آسمانی ہدایت‘ وحی کی روایت اور مذہبی تعلیمات سے منہ موڑ کر اپنے حواس و عقل سے سوچتا ہے (کتبِ تفسیر اور عقیدہ کی اصطلاح میں اھواء) تو وہ صرف تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ہے۔ اس میں ہم اہلِ اسلام کے لیے عبرت اور سبق آموزی کا بڑا سامان ہے۔ قرآن کریم کی سورۃ الاعراف‘ آیت ۱۴۶ میں اللہ تعالیٰ اس ضمن میں صاف اور واضح اصولی رہنمائی فراہم کرتے ہیں:

﴿سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰيٰتِىَ الَّذِيۡنَ يَتَكَبَّرُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَـقِّ ؕ وَاِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡا بِهَا ۚ وَاِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الرُّشۡدِ لَا يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا ۚ وَاِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الۡغَىِّ يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِيۡنَ ۝﴾

’’میں پھیر دوں گا اپنی آیات سے ان لوگوں (کے رُخ) کو جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں۔ اور اگر وہ دیکھ بھی لیں ساری نشانیاں تب بھی وہ ان پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اور اگر وہ دیکھ بھی لیں ہدایت کا راستہ تب بھی اس راستے کو اختیار نہیں کریں گے۔ اور اگر وہ دیکھیں برائی کا راستہ تو اسے وہ (فوراً) اختیار کر لیں گے۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے تغافل برتتے رہے۔‘‘

کتاب میں مصنف نے عصری فکر کی وہ نہج جس میں انسان کے بارے میں کلاسیکل اور دینی لٹریچر میں عظمت' کائنات کا گل سرسبد اور خلیفۃ اللہ ہونے کا بیان ہے' کو ردّ کرتے ہوئے دو مخالف اور extreme نقطہ ہائے نظر بیان کیے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے نہایت محنت اور وسعت نظر کے ساتھ دونوں جانب کے مغربی مفکّرین اور اہلِ قلم حضرات وخواتین کے افکار اختصار کے ساتھ مرتب کیے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو نہ صرف اپنے خبطِ عظمت اور غرہ سے نکالا جائے بلکہ اس کو عالمی منظر (scenario) سے بالکل غائب ہی کر دیا جائے تو یہ باقی موجودات کے لیے بہتر ہوگا۔ فرانسیسی دانش وَر مشل فوکو کا خیال تو یہاں تک ہے کہ انسان ڈیڑھ دو سو سال میں صفحہ ہستی سے غائب (erase) ہو جائے گا۔ ان مفکرین کا خیال ہے کہ انسان نے گزشتہ تاریخی ادوار میں نیچر اور sub-human مخلوقات کے ساتھ انتہائی منفی رویہ اختیار کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اب اس کا یہاں سے غائب اور ہٹ جانا ہی بہتر ہے۔ اسے یہ حضرات اینتھروپوسین اینٹی ہیومن ازم (Anthropocene Anti-humanism) کا نام دیتے ہیں۔☆ اس کی عملی سٹریٹیجی کے ضمن میں اس پوری سوچ سے اتفاق رکھنے والے لوگ دو ماڈلز بیان کرتے ہیں' اور دونوں ہی انتہائی مضحکہ خیز اور بودے ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ حضرت انسان سماج' سائنس وٹیکنالوجی اور تمدن کے معاملات میں پیچھے سے پیچھے چلا جائے حتیٰ کہ فطرت اور حیوانوں کی سطح پر آ جائے۔ یعنی ہر اعتبار سے ماضی کی طرف رجوع یعنی primitivism اور تہذیب یافتہ ''انسانیت'' کو مکمل طور پر ختم (undo) کرنے کی حکمتِ عملی۔ دوسری صورت ٹرانس/ پوسٹ ہیومن ازم کی ہے جس کے مطابق جدید ترین ٹیکنالوجی GNR یعنی Genetic, Nano-technology and Robotics کے ذریعے انسان بائیولوجی کو transcend کر کے موت کو شکست دے دے گا اور جسم سے بھی آرٹیفشل intelligence کی مدد سے چھٹکارا حاصل کر لے گا۔ مذکورہ ہر دو صورتوں میں جدید انسان reconfigure ہو کر لافانی ہو جائے گا' اور یہ ٹرانس ہیومن فیز ہوگا۔ جگہ کی تنگی کے باعث راقم نے اس تخیلاتی گردوں کی ہلکی سی جھلک تحریر کی ہے۔ قارئین اس کی دلچسپ تفصیلات اور گہرا علمی تجزیہ وتبصرہ قرآن اکیڈمی کے استاذ اور سکالر ڈاکٹر رشید ارشد سلمہ کی گھنٹے گھنٹے کی دو ویڈیوز میں سن سکتے ہیں۔☆☆

سطورِ بالا میں راقم نے مغرب کی جاہلیتِ جدیدہ کی کچھ جھلکیاں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ

☆ مغربی ریسرچرز کے مطابق بنی نوع انسان بڑے پیمانے پر نباتاتی اور حیوانی انواع کے خاتمے' موسمیاتی تبدیلیوں اور ماحولیاتی انحطاط کا ذمہ دار اور مجرم ہے۔ چنانچہ ''انسانیت'' ہی کے تصور اور تعین کو بدلنا ازحد ضروری ہے۔ ہمیں ''انسان'' کے اس پورے تصور کو تج دینا ہوگا جو تمام مبنی بروحی ادیان اور عرفانی لٹریچر میں مذکور ہے۔ یاللعجب!

☆☆ *Book Talk by Dr. Rasheed Arshad/ The Revolt Against Humanity by Adam Kirsch.*
https://www.youtube.com/live/3uAoVRRR1fo?feature=share
https://www.youtube.com/live/rc2UOmwdxVE?feature=share

اُمّتِ مُسلمہ کے کثیر دانش ور بھی مغرب کے تہذیب و افکار سے متاثر ہو کر آسمانی ہدایت کو پس پشت ڈال رہے ہیں۔ تمدن‘ اجتماعِ انسانیت اور لیڈر شپ کے بارے میں قرآن وسُنّت سے ملنے والی روشن ہدایت کے مقابلے میں وہ جان لاک‘ ہابز‘ روسو اور دوسرے غیر مسلم اور سیکولر لبرل مفکرین کے خیالات کو فخر کے ساتھ اپنا رہے ہیں۔ یوں سیکولرائزیشن کا عمل تیزی سے عالمی سطح پر اپنے قدم جما رہا ہے۔ اعلانیہ مسلم اکثریتی ریاستوں (confessional Muslim states) کا سیاسی سٹرکچر اور داخلی حکومتی نظام پورے طور پر مغربی لادینی جمہوری اصولوں کے تحت اور سودی معیشت پر مبنی ہے‘ تاہم کم از کم اہل سُنّت کے منبر و محراب سے قرآن وسُنّت کی بے آمیز اصولی تعلیمات بیان کی جاتی ہیں‘ اور دین کو اصالت وصلابت (قرآن وسُنّت اور ورثہ سلف سے تمسک وکلیت) کے ساتھ سامعین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

راقم عالَمِ اسلام اور ملّتِ اسلامیہ پر کفر والحاد کے سیلاب بلاخیز کے بارے میں مطالعہ کر رہا تھا کہ اچانک پچاس (۵۰) صفحات پر مبنی ایک بہت ہی دھماکا خیز تحریر واٹس ایپ پر پی ڈی ایف شکل میں ملی‘ جس کا عنوان ہے:

Reclaim Political Islam from the Islamists to Raise Moderate Muslim Voices

یہ تحریر Tony Blair Institute for Global Change نے جون ۲۰۲۳ء میں جاری کی ہے۔ ٹائٹل پر مصنّفین کے دو نام اسامہ حسن اور میتھیو گوڈون دیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر اسامہ حسن راقم کے دوست واستاذ ڈاکٹر مولانا صہیب حسن صاحب کے صاحب زادے ہیں‘ جن کا مضمون بھی قارئین حکمتِ قرآن کے زیرِنظر شمارے میں پڑھیں گے۔

اسامہ حسن کی پیدائش اور پھر ساری تعلیم انگلینڈ میں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم ڈاکٹریٹ لیول تک انہوں نے لندن کے امپیریل کالج اور کیمبرج یونیورسٹی سے حاصل کی۔ حافظ قرآن ہیں اور مساجد میں خطابِ جمعہ اور امامت کرتے رہے ہیں۔ البتہ ٹونی بلیئر (سابق وزیر اعظم برطانیہ) کے ادارے میں راہ ورسم کے بعد جو تحولِ عظیم ان کے افکار میں آیا ہے‘ وہ انتہائی حیران کن بلکہ تشویش ناک ہے۔ مذکورہ تحریر میں وہ پورے طور پر ’’فضائے مغرب‘‘ گزیدہ نظر آتے ہیں۔ موڈریٹ مسلم نقطہ نظر کو اپنانے میں انہوں نے اسلام کے چودہ سو سالوں کے دوران شان دار علمی و فکری کام (جو ہمارے مشاہیر اسلاف نے بہت محنت اور انتہائی گہری اور عمیق نظر کے ساتھ کیا) کو قرونِ وسطیٰ کا فرسودہ اور گھسا پٹا (outdated) فکر کہہ کر ردّ کر دیا ہے۔ پھر یہ کہ دین کی بنیادی اصطلاحات مانند خلافت‘ شریعت اور جہاد کو بالکل سیکولر اور compromised انداز میں redefine کیا ہے‘ جو ایک روایتی عقیدے پر کھڑے مسلمان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

میں یہاں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے مدیر ’’ایقاظ‘‘ جناب حامد کمال الدین کے اس خیال کا ذکر

کروں گا جو میرے اندازے میں عصرِ حاضر کی گلوبل صورت حال کی صحیح عکاسی کرتا ہے: ''ہمارے اس دَور میں تہذیبوں اور ملتوں کے فرق تیزی کے ساتھ مٹ رہے ہیں' اور ایک یک رنگی انسانیت پراسس میں ہے۔'' جبکہ واقعہ یہ ہے کہ آسمانی ہدایت کو ماننے والے شخص کے لیے یہ قطعاً ممکن نہیں ہے کہ وہ اہلِ ایمان اور اہلِ کفروالحاد کے درمیان binary (فرق وتفاوت) کو کسی طور پر بھی ختم کر سکے۔

جناب حامد کمال الدین نے موجودہ سیاسی وعمرانی مسائل کے ضمن میں امام ابن تیمیہؒ کے مجموع الفتاویٰ میں سے خلافت وملوکیت سے متعلق فصول کا بہت گہرا مطالعہ اور حواشی وتعلیقات کے ساتھ اردو ترجمہ کیا ہے۔ ''خلافت وملوکیت'' کے عنوان سے کتاب کے آغاز میں عرض مترجم کے تحت انہوں نے دقتِ نظر سے بعض اہم اور قیمتی افکار پیش کیے ہیں' جو قارئین کے نظر ومطالعہ کے لیے من وعن نقل کیے جا رہے ہیں۔ میری دانست میں انہوں نے گلوبلائزیشن اور اس کے dynamics کی صحیح نباضی کرتے ہوئے تحریک اسلامی اور احیائے ملت کے کارکنوں کو بہت سنجیدہ اور وقیع رہنمائی دی ہے۔ وہ ایک خلاق ذہن کے ساتھ genuine inspirer ہیں' اور محض cultist نہیں ہیں:

''ان فصول میں ہماری دلچسپی کی ایک خاص وجہ: ابن تیمیہؒ کے یہ مقالات اسلام کے تصورِ اجتماع کو ایک اعلیٰ ضبط دینے میں مفید ہیں۔ ہماری دانست میں اصحابِ نظر اس سے ایک ''پیراڈائم شفٹ'' کی بنیاد پا سکتے ہیں۔ ''اجتماع'' کے وہ تصورات جنہیں الحاد پر کھڑی ایک تہذیب نے اپنی تعلیم وتحقیق کی heavy industry کے ذریعے آج ''بدیہات'' کا رنگ دے ڈالا ہے' دورِ آخر کا ایک واقعہ ہیں' جس سے ماضی میں ہمیں واسطہ نہیں پڑا؛ پس یہ تو ممکن نہیں کہ ان (ہیومن اسٹ) ''بدیہات'' کے بطلان پر متقدمین سے کوئی باقاعدہ مواد لائیں۔ یہ کام تو ان معاصر عقول کے سر رہا جنہیں ''سُنّت وجماعت'' کے اوزاروں پر دسترس ہو۔ ابن تیمیہؒ کے یہاں' بس بعض جگہوں پر ہمیں کچھ touch ملتے ہیں جو اس کام کو ایک گونہ آسان کریں۔ کتاب کا یہی پہلو ہمیں سب سے اہم لگا۔ لہٰذا ترجمہ کے علاوہ کچھ کاوش ہم نے اسی حوالہ سے کی:

(۱) ہیومن اسٹ تصورات کے بطلان پر جہاں جہاں ابن تیمیہؒ کے کلام میں ہمیں کچھ ٹچ ملے' حاشیوں میں ہم نے اس کی تھوڑی نشان دہی کر دی۔

(۲) البتہ ایسے مقامات جو کسی قدر کھولنا ضروری تھے' یا کچھ مباحث جن پر ان مقامات کا کھلنا منحصر تھا' وہاں ہم نے ''تعلیقات'' کا سہارا لیا' جو ایک علیحدہ کتاب میں شائع ہوں گی' ان شاء اللہ' بعنوان ''مملکتِ اسلام بموازنہ ماڈرن سٹیٹ' خلافت' ملوکیت مؤلفہ ابن تیمیہؒ کی روشنی میں۔''

نو واردات کے حوالہ سے: آج عالمِ اسلام کے اندر ہمیں دو مسائل کا بیک وقت سامنا ہے:

(۱) ایک وہ مسلمان جو ہیومن ازم کے گھاٹ سے پی پی کر اسلام کی دریافتِ نو (rediscovering Islam) کی مشق فرماتے آ رہے ہیں۔ یہ درجہ بدرجہ کئی طبقے ہیں۔ حاشیوں اور تعلیقات میں ہماری زیادہ توجہ انہی کی طرف رہی' کیونکہ یہ اسلام کے مسخ ہی کا آلۂ کار بنے جاتے ہیں جبکہ اس وقت کا سب سے بڑا

محاذ ہماری نظر میں اسلام کو خالص رکھنا ہے۔ یہ سمجھنا درست نہیں کہ یہ ''ری فارمسٹ روش'' دی گئی صورت حال میں مسلمانوں کو ایک حل نکال کر دینے کی کوشش ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ''اسلام کی تفسیرِ نو'' کا ایک بھیانک عمل ہے، جس کے لیے ان کا استیحاء (inspiration) جدید تصورِ اجتماع سے ہو رہا ہے۔ جب بھی یہ اپنے تئیں پہلے کام کی طرف بڑھے گی (مسلمانوں کو اندریں حالات ایک راہ بنا کر دینا) لامحالہ دوسرا کام کر آئے گی (اسلام ہی کا ایک نیا ورژن نکالنا)۔ اس لیے کہ کچھ ہیومنسٹ مسلمات جو اسلام کے ساتھ اس کے صمیم (core) میں ہی متعارض ہیں، یہاں اذہان کی تہ میں اتر کر، دلوں میں کھب گئے ہوئے ہیں (أُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ)۔ نتیجتاً ایک ''دی گئی صورتِ حال'' میں اسلام کو راہ بنا کر دینا ان کا مسئلہ نہیں رہا، اگرچہ یہ کسی وقت ایسا سمجھ رہے ہوں گے، بلکہ مسئلہ ہو گیا ہے الحاد کی کوکھ سے برآمد ہونے والے ایک جہانی عمل کو ''اسلام'' میں راہ بنا کر دینا۔ اس طبقے کا ہر ذہن اور ہر shade دانستہ یا نادانستہ، تھوڑی دیر میں عالَمِ اسلام کے اندر ہمارے دشمن کیمپ ہی کا ہراول ہو کر رہے گا۔ لہٰذا اس سے ہوشیار رہنا ہماری اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت!

(۲) دوسرا، ہمارے اسلامی تراث سے وابستہ طبقوں میں پایا جانے والا وہ ایک جامد یا آئیڈیلسٹ عنصر جو کچھ اصول وقواعد کو لاگو کرنے میں زمانے اور احوال کے فرق کو قطعی غیر متعلقہ جانتا ہے۔ تراث سے ملنے والے یہ اصول وقواعد جو بے شک حق ہیں، البتہ ایک الجھی صورتِ حال کے اندر جہاں حسنات وسیئات خلط ہوں، یا جہاں حق کے ان بہت سے ابواب کو قائم رکھنے کے لیے درکار ''قدرت'' مفقود ہو۔ اپنے اسلامی تراث سے ملنے والے یہ اصول وقواعد وہاں کتنے مختلف طریقوں سے لاگو ہوں گے اور وہاں ہمیں اسلام کے کس مطلوب کو کس مطلوب کی قیمت پر حاصل کر کے رہنا ہو گا، یہ سب مباحث ان حضرات کے کوچے میں داخلہ نہیں پاتے۔ نتیجتاً ''الجماعہ'' کے سب یا اکثر زریں مطالب ان کے یہاں ''زورِ بیان'' یا ''امید و آرزو'' (رومانس) کی چیز بن رہتے ہیں (جس کا ایک کلائمکس ''انتظارِ مہدی'' ہے)؛ جبکہ یہ نرے عزلت نشین، زندگی کی دوڑ سے باہر بلکہ زندگی کی روانی کے آگے بند باندھنے والے۔ اس (آئیڈیلسٹ) کے رُخ پر جانے والا ایک طبقہ ماضی کے محاکمہ کی طرف بڑھتا ہے اور نبی ﷺ کی رحلت کے تیس سال بعد اسلام کا سیاسی وجود کُرّہَ ارض پر ختم ٹھہراتا یا اس پر کچھ سنگین سوالات اٹھاتا ہے، جبکہ اس (آئیڈیلسٹ) رُخ پر جانے والا ایک دوسرا طبقہ حال کی طرف متوجہ ہوتا ہے جہاں مسلمانوں کے بہت پیچھے رہ جانے (نیز استعمار کا مفتوح ہو جانے) کے نتیجے میں زندگی کے اکثر ندی نالے سرے سے کفار کے رُخ پر بہنے لگتے ہیں؛ اور جنہیں پھر سے اسلام کے رُخ پر بہانے کے لیے شاید صدیوں کی جہد اور صبر درکار ہو اور بیچ کا یہ عرصہ (خالص اسلام پر اصولی واعتقادی طور پر جمے رہ کر) عمل کے میدان میں ''مصالح اور مفاسد'' کے ایک ہر دَم بدلتے موازنہ کی بنیاد پر راستہ بناتے چلے جانے کی ضرورت.... تو یہاں یہ (آئیڈیلسٹ) ذہن زمانے کو اپنے انہی زریں اصول وقواعد کی بنیاد پر بدل جانے کا ''نوٹس'' دیتا.... اور تاوقتیکہ زمانہ اس کی شرطوں پر نہیں آتا، یہ یہاں کے اجتماعی/سیاسی عمل میں اسلام اور مسلمان کا کوئی کردار نہیں دیکھتا۔ نتیجہ: اہلِ عزلت، منفیت، یاسیت، سردمہری اور بے دلی۔ یا پھر ایک بھڑکیلی جذباتیت، کہ اس سے بھی بڑی فرسٹریشن

کا پیش خیمہ۔ جبکہ اسلام کے اجتماعی مطالب‘ جن سے اُمّت ایک دن لاتعلق نہیں رہ سکتی‘ ایک ’’غیر معینہ‘‘ مدت تک معطل! اس جامد یا آئیڈیلسٹ ذہن کے لیے بھی ابن تیمیہؒ کے ان مقالات میں بہت کچھ آیا ہے‘ جس پر ہم اپنے حاشیوں یا تعلیقات میں کچھ نشان دہی کریں گے۔ یہ ہر دو پہلو نظر میں رہیں تو یہ کتاب ہمیں دو متحارب تباہ کن راہوں سے بچ نکلنے کے لیے ایک محفوظ متوازن سمت دیتی ہے۔‘‘

یہاں ڈاکٹر اسامہ حسن کا موازنہ انگلستان ہی میں پلے بڑھے‘ پاکستان سے ۱۹۶۰ء کے اوائل میں بریڈ فورڈ نقل مکانی کرنے والے بس ڈرائیور کے صاحب زادے ڈاکٹر شبیر اختر سے چشم کشا ہوگا۔ ان کا گزشتہ ماہ (۲۵ جولائی کو) صرف ۶۳ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارْحَمْہُ! ان کی متعدد تصنیفات میں سے کم ازکم دو نے اکیڈیمیا میں اسلام کی پولیٹکل اور empowered religion کی حیثیت سے دھاک بٹھائی ہے:

☆ پہلی کتاب ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی‘ بعنوان The Quran & The Secular Mind

☆ دوسری ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئی: Islam as Political Religion: The Future of an Imperial Faith

یہ دونوں کتابیں خاصی ضخیم اور انتہائی علمی زبان میں کثیر الجہتی ٹھوس مواد لیے ہوئے ہیں۔ مصنف عبرانی اور کئی دوسری کلاسیکل زبانوں بشمول عربی سے واقفیت کے ساتھ ان میں چھپے ہوئے لٹریچر پر عبور اور ان کے مکمل ریفرنس دینے پر قادر تھے۔ انگلستان کی اعلیٰ تعلیم گاہوں کے لبرل‘ ہیومن اسٹ اور ملحدانہ ماحول اور بریڈ فورڈ اور لندن کے بہت معمولی اور پس ماندہ ghettos میں بود و باش کے باوجود ڈاکٹر شبیر اختر نے نہ صرف مغربی فلسفہ اور سماجی علوم میں گہری بصیرت اور ناقدانہ نظر حاصل کی بلکہ اسلامی علوم اور معارف کا وسیع اور عمیق مطالعہ کرکے ’’اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر‘‘ پر پختہ یقین وایقان کا حصول کیا جو ان کی طبع شدہ تصنیفات میں بولتا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں کتابیں کسی معمولی پبلشر نے نہیں بلکہ انگلینڈ‘ کینیڈا اور امریکہ میں شاخیں رکھنے والے عالمی سطح کے معروف اور بڑے پبلشر Routledge نے شائع کی ہیں۔ اہلِ علم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ بڑے پبلشر کسی بھی کتاب کو peer reviews کے سخت اور طویل مرحلے سے گزارنے کے بعد ہی اسے قابلِ اشاعت قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر شبیر اختر نے اسلام کو امپیریل فیتھ کسی جبر اور استحصال اور مبنی بر شرک والحاد کے نظام کے عالمی غلبے اور قتل وغارت کے معنی میں نہیں لیا‘ بلکہ دینِ حق کے نظریہ توحید‘ عبادتِ رب اور اُخروی فوز وفلاح کے پیغام کو پوری دنیا کے لوگوں تک پہنچانے اور انہیں ایک اللہ واحد کے آگے جھکنے اور سجدہ ریز ہونے کے جہاد کے مفہوم میں لیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ٹھیٹ قرآنی اور ختم نبوت کے بعد ہم اُمتیوں پر عائد فرائض کے عین مطابق ہے۔ راقم کا حسن ظن ہے کہ اگر ڈاکٹر اسامہ حسن نے ان دو کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرلیا ہوتا تو وہ ٹونی بلیئر انسٹیٹیوٹ کے تحت stateless domesticated Islam کے پیش کنندہ بننے سے بچ جاتے!

اس تحریر کا عنوان بننے والے شعر کا دوسرا مصرعہ بھی لائقِ توجہ ہے: ع ’’کشتۂ افرنگیاں بے حرب وضرب۔‘‘ راقم نے یہ شعر علامہ اقبالؒ کی آخری فارسی مثنوی ’’پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق‘‘ سے منتخب کیا ہے‘ جس کا اردو میں منظوم ترجمہ پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس طرح کیا ہے: ؎

ہم سب پر حاوی ہے تہذیب مغرب کا سحر
بے ضرب و حرب ہیں افرنگی کے آگے ڈھیر

اس تحریر سے کسی کی تحقیر مقصود نہیں بلکہ احقاقِ حق اور دینی حمیت کی خاطر یہ چند سطور رقم ہوئیں۔ وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین!

❁❁❁

بقیہ: ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا منہجِ تفسیر

(۲۱) بیان القرآن‘ ج۴‘ ص ۱۰۳‘۷۔
(۲۲) بیان القرآن‘ ج۵‘ ص ۱۹۵۔
(۲۳) بیان القرآن‘ ج۵‘ ص ۲۴۱۔
(۲۴) بیان القرآن‘ ج۲‘ ص ۶‘۷۔
(۲۵) بیان القرآن‘ ج۲‘ ص ۲۳۸‘ ۲۳۷‘ ۱۹۸‘ ۱۹۷۔
(۲۶) بیان القرآن‘ ج۲‘ ص ۲۳۸
(۲۷) بیان القرآن‘ ج۷‘ ص ۱۲۱‘ ۱۱۸۔
(۲۸) بیان القرآن‘ ج۷‘ ص ۴۸۲۔
(۲۹) بیان القرآن‘ ج۷‘ ص ۲۱۵۔
(۳۰) بیان القرآن‘ ج۱‘ ص ۶۳‘ ۶۲۔
(۳۱) بیان القرآن‘ ج۱‘ ص ۲۰۰۔
(۳۲) بیان القرآن‘ ج۲‘ ص ۷۔
(۳۳) بیان القرآن‘ ج۲‘ ص ۷
(۳۴) بیان القرآن‘ ج۲‘ ص ۷
(۳۵) بیان القرآن‘ ج۲‘ ص ۸۹‘۷۔
(۳۶) بیان القرآن‘ ج۲‘ ص ۱۱۸
(۳۷) بیان القرآن‘ ج۲‘ ص ۱۱۸۔
(۳۸) بیان القرآن‘ ج۲‘ ص ۱۱۹۔
(۳۹) بیان القرآن‘ ج۴‘ ص ۲۸۱‘ ۲۸۲۔
(۴۰) بیان القرآن‘ ج۴‘ ص ۳۴۱۔
(۴۱) بیان القرآن‘ ج۷‘ ص ۲۱۵۔
(۴۲) بیان القرآن‘ ج۷‘ ص ۲۳۱۔
(۴۳) بیان القرآن‘ ج۲‘ ص ۷۔
(۴۴) بیان القرآن‘ ج۱‘ ص ۲۰۲۔
(۴۵) بیان القرآن‘ ج۱‘ ص ۳۲۲۔
(۴۶) بیان القرآن‘ ج۱‘ ص ۶۳‘ ۲۲۲۔
(۴۷) ڈاکٹر‘ اسرار احمد‘ منتخب نصاب‘ ج۲‘ ص ۱۳۹‘ ۸۸‘ ۷۴‘ مرکزی انجمن خدام القرآن‘ لاہور‘ ۲۰۱۰ء
(۴۸) بیان القرآن‘ ج۷‘ ص ۲۵۶۔

❁❁❁

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

تذکرہ مرکزی انجمن خُدّام القُرآن

ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

میں اپنی تحریر کا آغاز اس خیر سے کرنا چاہتا ہوں کہ جو خاصہ خاصانِ رُسل کی تعلیمات کا نچوڑ ہے‘ اُس دین کا جو ’’فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ‘‘ کہہ کر خیر کی طرف سبقت لے جانے کا حکم دیتا ہے‘ اس اُمّت کا جو خیر الامم قرار دی گئی ہے: ﴿کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ﴾ اور انفرادی سطح پر اس وصف کا جو ایک شخص کو ’’خَیْرُکُمْ‘‘ کی صف میں لاکر کھڑا کر دیتا ہے‘ اور وہ ہے:

((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ))

’’تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھتا اور سکھاتا ہے۔‘‘

آیئے تو پھر ایسے ہی خیر عظیم کے حامل ایک شخص کا تذکرہ ہو جائے۔ یہ تذکرہ ہے ایک خادمِ قرآن کا‘ عاشق الفرقان کا اور داعی الی اللہ بالحجۃ والبرہان کا۔ ابتدا کرتا ہوں اپنے اس اولین تعارف کا جو اس ہستی بے بدل سے حاصل ہوا۔ میں اپنی عمر کے بیسویں سال میں قدم رکھ چکا تھا کہ والد محترم‘ استاذی وشیخی‘ مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ کی طرف سے ہدایت ملی کہ میں منٹگمری (موجودہ ساہیوال) کا قصد کروں‘ ابا جان کے ہراول دستے کے طور پر کہ وہ چند ماہ میں وہاں منتقل ہونے کا عزم کر چکے تھے تا کہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے مجوزہ قرآن ہوسٹل میں مقیم طلبہ کو زبانِ عربی اور علومِ اسلامیہ کا رمز شناس بنا سکوں۔ یہ میرا اُن کے ساتھ پہلا تعارف تھا اور ان کے ساتھ برادرم ابصار (کہ اُس وقت ان کے نام کے ساتھ ’’ڈاکٹر‘‘ کا سابقہ نہ تھا) اور برادرم وقار سے بھی۔ ڈاکٹر صاحب کو اس عالم میں دیکھا کہ مطب سے فارغ ہونے کے بعد ان کا اوڑھنا بچھونا‘ ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے قرآن کی سماعت‘ درسِ قرآن کا اہتمام اور جب موقع ملے تو مساجد میں خطبہ جمعہ کے توسط سے قرآن کے رموز واسرار بلکہ قرآن کی بھرپور دعوت کا ابلاغ تھا۔

ان کی تقاریر میں فصاحت لسانی‘ افکار وخیالات کی روانی‘ قرآنی آیات کا استحضار‘ اشعار کا برمحل استعمال اور پھر آواز کی گھن گرج‘ لہجے کا زیر و بم ایک سامع کو مسحور کرنے کے لیے کافی رہتا تھا۔ غالباً تین ماہ کے قیام کے بعد مَیں طلبِ علم کے لیے سوئے مدینہ روانہ ہو گیا اور پھر چار سال کے بعد (یعنی ۱۹۶۶ء میں) فراغت ہوئی تو قضا و قدر کے فیصلے درس وتدریس اور دعوت وتبلیغ کے عنوان سے مجھے پہلے مشرقی افریقہ اور پھر جزائر انگلستان کی راہ دکھاتے گئے۔

اس دوران تعطیلات میں والدین سے ملاقات کے لیے مدینہ منورہ آتا جاتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب سے ایک تفصیلی ملاقات مدینہ منورہ ہی میں ہوئی جب وہ وہاں غالباً ایک ماہ ایک پُرسکون ماحول میں اپنے آئندہ لائحہ عمل

کے بارے میں سوچ بچار کرنا چاہ رہے تھے۔ اپنے اس مختصر قیام میں میرے لیے ریاض جانا بھی ضروری تھا۔ ڈاکٹر صاحب بھی میرے ہم رکاب رہے اور یوں اس سفر میں باہمی مکالمہ بھی رہا۔ ان کی زندگی کے نشیب وفراز جاننے کا موقع ملا اور دعوتِ دین کے بارے میں ان کی مساعی‘ ان کی جِدّ وجُہد اور ان کے آئندہ پروگرام کا عندیہ بھی ملا۔ ڈاکٹر صاحب کی مختصر کتاب ”مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق“ میرے ہاتھ لگی۔ پڑھی تو دل ودماغ پر چھا گئی اور اسے عربی کے قالب میں ڈھالنے کا داعیہ پیدا ہوا۔ چنانچہ پہلے تو اس کا ترجمہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے آرگن ”البعث الاسلامی“ میں بالاقساط شائع ہوتا رہا اور پھر کتابی شکل میں منظر عام پر آیا۔ غالباً یہی وہ زمانہ تھا کہ جب ڈاکٹر صاحب نے ”انجمن خدام القرآن“ کی داغ بیل ڈالی۔ گویا انہوں نے اپنے مجوزہ پروگرام کی ”خشت اول“ کھڑی کر دی تھی۔

وہ پودا جو انہوں نے پچاس سال قبل سرزمین لاہور میں لگایا تھا‘ آج ایک ثمر بار شجر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ جس کے برگ و بار میثاق‘ حکمتِ قرآن اور پھر ندائے خلافت کی شکل میں پھریرے لہراتے نظر آتے ہیں۔ ایک زمانے میں وہ طبیب کی حیثیت سے مسیحا کے روپ میں نظر آئے اور جب قبائے طبابت اُتار پھینکی اور ردائے خلافت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا تو پھر صرف قرآن کے ہو کر رہ گئے۔ وہ عربی زبان کے کوئی سکّہ بند طالب علم نہ تھے لیکن پھر بھی انہوں نے اس سے اتنا تعارف حاصل کر لیا تھا کہ وہ اپنے دروس ومحاضرات میں قرآنی الفاظ اور محاورات کی کہیں لُغوی تحقیق اور کہیں ان میں پنہاں معانی کو آشکار کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ انہوں نے یہ تحریر کیا ہے کہ قرآن کے بعض الفاظ بظاہر مترادف (synonyms) دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کے معانی میں ایک دَقیق فرق ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جس کا تعلق اعجازِ قرآن سے ہے۔

اس ضمن میں قرآن کے تعلق سے ایک معاصر عراقی عالم لغت کا تذکرہ کرتا چلوں کہ الفاظِ قرآن کے معانی ومطالب کو جس طریقہ سے وہ واضح کرتے رہے ہیں وہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے خوشہ چین طلبہ اور اہلِ علم کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ یہ ہیں ڈاکٹر فاضل صالح السامرائی جو اپنے سراپا میں علامہ اقبال کی طرح بے ریش ہیں لیکن انہی کی طرح قرآن کا ذوق وشوق رکھتے ہیں۔ اس بحر کی جو غواصی انہوں نے کی ہے وہ عربی دان حضرات اور شائقین علوم قرآنی کے لیے ایک انمول سرمایہ ہے۔

بطورِ نمونہ چند الفاظ کا تذکرہ کرتا ہوں جن کے معانی ومطالب بلکہ لُغوی تحقیق پر ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے خامہ فرسائی کی ہے اور مَیں اس کا ربط ڈاکٹر فاضل صالح السامرائی کے اٹھائے ہوئے جواہر دُرَر سے کرنا چاہتا ہوں کہ جس سے قرآن کے لُغوی اعجاز کا ایک انمول پہلو ہمارے سامنے واشگاف ہوتا نظر آتا ہے۔

(ا) قرآن میں اخوت کے بیان کے لیے دو لفظ آئے ہیں: إخوۃ اور إخوان

اردو یا انگریزی میں دونوں کو مترادف ہی سمجھا جائے گا‘ لیکن بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ”إخوۃ“ (جمع أخ) سگے برادران یا ایک باپ کی اولاد کے لیے استعمال ہوا ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۱ میں جہاں وارثین کے حصص بیان ہوئے ہیں وہاں بھائیوں کے لیے ”إخوۃ“ کا لفظ لایا گیا ہے۔ ایسے ہی سورۃ

یوسف میں ﴿لَقَدۡ كَانَ فِيۡ يُوۡسُفَ وَاِخۡوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيۡنَ ۞﴾ کہہ کر برادرانِ یوسف کے لیے یہی لفظ استعمال ہوا ہے کہ جو ایک باپ (سیدنا یعقوبؑ) کی اولاد تھے۔ اس کے بالمقابل لفظ ''اِخوان'' سگے بھائیوں کے علاوہ اس بھائی چارے کے اظہار کے لیے بھی لایا گیا ہے جو اہلِ ایمان کے مابین پایا جاتا ہے' جیسے ارشاد ہوا: ﴿فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا ۚ﴾ (آل عمران:۱۰۳) یا ایک قوم کا فرد ہونے کی حیثیت سے' جیسے سورۂ ق میں قومِ لوط کی جگہ ''اِخۡوَانُ لُوۡطٍ'' کا ذکر کیا گیا۔ سورۃ الحجرات میں جو ﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَةٌ﴾ (آیت ۱۰) کہا گیا تو دراصل اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو سگے بھائیوں کی طرح دیکھنا چاہتے ہیں' اس لیے مؤمنین کے ساتھ ''اِخۡوَة'' کا لفظ لایا گیا۔

(۲) وصیت کے لیے قرآن میں دو لفظ آئے ہیں: اَوۡصٰى اور وَصّٰى

بظاہر دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے لیکن قرآن میں جہاں یہ الفاظ آئے ہیں وہاں سیاق و سباق کی روشنی میں ان دونوں میں ایک دقیق فرق پایا جاتا ہے۔ اَوۡصٰى اور اس کا مضارع يُوۡصِيۡ جہاں بھی آیا ہے وہاں اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح مالی معاملات سے ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۱ کا آغاز یوں ہوتا ہے: ﴿يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِيۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ ۗ﴾ یہاں ایک میت کے ورثہ کے حصص کا بیان ہو رہا ہے جس کا تعلق مال سے ہے۔ وصیت کے علاوہ ''يُوۡصِيۡ'' کا لفظ مختلف صیغوں کے ساتھ پانچ دفعہ دہرایا گیا ہے۔ اس کے بالمقابل جہاں بھی ''وَصّٰى'' (باب تفعیل) کے ساتھ آیا ہے وہاں اس کے بعد اس وصیت کا بیان ہے جس کا تعلق دین سے یا کسی دینی امر سے ہے' چاہے وہ موت سے پہلے ہو یا عمومی طور پر ایک اچھی بات کی نصیحت ہو۔ جیسے ارشاد فرمایا:

﴿وَوَصّٰى بِهَاۤ اِبۡرٰهٖمُ بَنِيۡهِ وَيَعۡقُوۡبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰى لَكُمُ الدِّيۡنَ فَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ۞﴾ (البقرة)

''اور اس بات کی وصیت ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو کی اور ایسے ہی یعقوب نے بھی۔ کہا کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے یقیناً تمہارے لیے دین (اسلام) کو چُن لیا ہے' تو تمہیں موت نہ آئے مگر اسلام کی حالت میں۔''

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کے لیے بھی یہی الفاظ کہے گئے:

﴿وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ ۚ﴾ (لقمٰن:۱۴)

دین کو تھام لینے' اسے قائم کرنے اور تفرقہ بازی نہ کرنے کی ہدایت چند اولوالعزم انبیاء کرامؑ کو نام لے کر کی گئی اور وہ بھی اسی لفظ ''وَصّٰى'' کے ساتھ۔ فرمایا:

﴿شَرَعَ لَكُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوۡحًا وَّالَّذِيۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ وَمَا وَصَّيۡنَا بِهٖۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمُوۡسٰى وَعِيۡسٰۤى اَنۡ اَقِيۡمُوا الدِّيۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِيۡهِ ؕ﴾ (الشوریٰ:۱۳)

''(اللہ نے) تمہارے لیے وہی دین قرار دیا ہے جس کی وصیت نوح کو کی تھی اور جس کی وحی آپ کو کی گئی اور جس کی وصیت ہم نے ابراہیم' موسیٰ اور عیسیٰ کو کی تھی کہ دین کو قائم کرنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا''

اب یہاں یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ سورۂ مریم میں بزبانِ عیسیٰؑ یہ کہلوایا گیا ہے:

﴿قَالَ اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰہِ ۟ؕ اٰتٰىنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا ﴿۳۰﴾ وَّ جَعَلَنِیۡ مُبٰرَکًا اَیۡنَ مَا کُنۡتُ ۪

وَ اَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ مَا دُمۡتُ حَیًّا ﴿۳۱﴾﴾

''اُس نے کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں' اُس نے مجھے کتاب عطا کی' مجھے نبی بنایا۔ اور مجھے جہاں کہیں بھی ہوں باعث برکت بنایا' اور جب تک میں زندہ ہوں مجھے نماز کا اور زکوٰۃ ادا کرتے رہنے کی وصیت کی۔''

اعتراض یہ ہے کہ یہاں ایک دینی امر کی طرف بھی بلفظ ''اَوۡصٰی'' اشارہ کیا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ یہاں ایک مالی عبادت (زکوٰۃ) کا بھی ذکر ہے تو اس کی مناسبت سے لفظ ''اوصٰی'' کا لایا جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔

(۳) وصیت کے اسی تعلق سے ایک اور بات سامنے آئی کہ قرآن کی تین آیات میں بلفظ ''وَصّٰی'' اولاد کو والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی ہدایت کی گئی' جیسے:

۞ ﴿وَ وَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡہِ حُسۡنًا ؕ﴾ (العنکبوت:۸)

۞ ﴿وَ وَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡہِ ۚ﴾ (لقمٰن:۱۴)

۞ ﴿وَ وَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡہِ اِحۡسٰنًا ؕ﴾ (الاحقاف:۱۵)

اور تین دوسری آیات میں بغیر لفظ ''وَصّٰی'' کے اسی تعلیم کو دہرایا گیا ہے' جیسے:

۞ ﴿وَ قَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ وَ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا ؕ﴾ (الاسراء:۲۳)

۞ ﴿وَ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ لَا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا وَّ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا﴾ (النساء:۳۶)

۞ ﴿قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمۡ عَلَیۡکُمۡ اَلَّا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا وَّ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا ۚ﴾ (الانعام:۱۵۱)

البتہ والدین کو اولاد کے لیے وصیت کا حکم صرف ایک ہی آیت میں دیا گیا ہے اور وہ ہے سورۃ النساء کی آیت ۱۱ جو وراثت سے تعلق رکھتی ہے اور جس کا آغاز ہوتا ہے ان الفاظ سے: ﴿یُوۡصِیۡکُمُ اللّٰہُ فِیۡۤ اَوۡلَادِکُمۡ ٭﴾۔ اس فرق کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ والد تو خود اپنی اولاد کی پرورش اور نگہداشت کرتا ہے لہٰذا اسے کسی خصوصی توجہ دلانے کی ضرورت نہ تھی' لیکن جہاں تک اولاد کا تعلق ہے تو انہیں اس امر کی طرف توجہ دلانے کی اشد ضرورت تھی کہ وہ اس وقت اپنے والدین کی خدمت بجالانے میں کوئی کسر نہ چھوڑیں جب وہ حاجت مند اور بے آسرا ہوں' کبرسنی اور دوسرے عوارض کی بنا پر دوسروں کے رحم وکرم پر ہوں' نہ یہ کہ وہ ان کی حیات ہی میں باپ کی جائیداد میں سے اپنا حصہ لینے کے لیے خود والدین پر عرصۂ حیات تنگ کرنے پر تُلے ہوئے ہوں۔

(۴) قرآن کی چار آیات میں موت کے ذکر سے پہلے ''حضر'' کا لفظ استعمال ہوا ہے:

۞ ﴿اَمۡ کُنۡتُمۡ شُہَدَآءَ اِذۡ حَضَرَ یَعۡقُوۡبَ الۡمَوۡتُ﴾ (البقرۃ:۱۳۳)

۞ ﴿کُتِبَ عَلَیۡکُمۡ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ﴾ (البقرۃ:۱۸۰)

۞ ﴿حَتّٰۤی اِذَا حَضَرَ اَحَدَہُمُ الۡمَوۡتُ﴾ (النساء:۱۸)

۞ ﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا شَہَادَۃُ بَیۡنِکُمۡ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ﴾ (المائدۃ:۱۰۶)

اوراس کے بالمقابل تین آیات میں ''جَاءَ'' اور ''اَتٰی'' کے الفاظ آئے ہیں' جیسے:

۞ ﴿حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ﴾ (الانعام:٦١)

۞ ﴿حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿٩٩﴾﴾ (المؤمنون)

۞ ﴿وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ﴾ (المنٰفقون:١٠)

ان آیات کے مطالعے سے یہ نکات ظاہر ہوتے ہیں:

(i) جہاں جہاں حَضَرَ آیا ہے وہاں کسی دُنیوی معاملے کا ذکر ہے' جیسے وصیت کرنا یا توبہ کرنا' اور جہاں ''جَآءَ'' یا ''اَتٰی'' آیا ہے وہاں موت سے متعلق کسی امر کا ذکر ہے۔

(ii) ان تمام آیات میں ''موت'' ہی فاعل ہے لیکن موت کا لفظ بعد میں ہے اور جسے موت آ رہی ہے' یعنی انسان اس کی ضمیر پہلے لائی گئی ہے۔ انسان چونکہ موت سے گھبراتا ہے اس لیے موت کے آنے کا ذکر کیا گیا نہ کہ انسان کا موت سے ہم آغوش ہونے کا۔ جس چیز سے وہ گھبرا رہا ہے اس کا ذکر مؤخر کر دیا گیا۔

(iii) انسان کی اس فطرتی خواہش کا خیال رکھا گیا کہ موت یا تو سرے سے نہ آئے' یا آئے تو تاخیر سے آئے' اس لیے موت کا ذکر ہمیشہ مؤخر ہی رکھا گیا۔ یہ بھی درست ہے کہ انسان کے ذہن اور شعور میں موت کا تصور کسی دُور پرے کی چیز کا سا ہی ہوتا ہے۔

(۵) سورۃ الحدید کی آیت ٢٠: ﴿اِعْلَمُوْۤا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ .....﴾ میں جن پانچ مراتب کا ذکر کیا گیا ہے' ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے انہیں ایک انسان کی زندگی کے پانچ مراحل سے جوڑ کر بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے' جسے مَیں ان کے تفردات میں سے سمجھتا ہوں۔

دُنیوی زندگی کے عہدِ طفولت میں لَعِبٌ (کھیل کُود) کا ذکر ''لَھْوٌ'' (غافل کرنے والی اشیاء) سے قبل کیا گیا ہے اور ایسا ہی ان تین آیات میں بھی کیا گیا ہے:

۞ ﴿وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ ؕ﴾ (الانعام:٣٢)

۞ ﴿وَذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَھُمْ لَعِبًا وَّلَھْوًا﴾ (الانعام:٧٠)

۞ ﴿اِنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ ؕ﴾ (محمد:٣٦)

لیکن دو آیات ایسی بھی ہیں جن میں ''لھو'' کو ''لعب'' سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی سورۃ الاعراف کی آیت ٥١: ﴿الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَھُمْ لَھْوًا وَّلَعِبًا﴾ اور سورۃ العنکبوت کی آیت ٦٤: ﴿وَمَا ھٰذِہِ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا لَھْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ﴾۔ یہاں ڈاکٹر فاضل صالح السامرائی کی نکتہ رس طبیعت سے مدد ملتی ہے کہ ایسا کیوں ہے! وہ کہتے ہیں کہ جہاں لَعِب (کھیل کود) کا ذکر ہے تو عہد طفولیت میں کھیل کا غلبہ ہوتا ہے۔ برادرانِ یوسف علیہ السلام نے بھی یوسف کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اپنے والد محترم کے سامنے یہی بہانہ تراشا تھا کہ ﴿اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا یَّرْتَعْ وَیَلْعَبْ﴾ (یوسف:١٢) ''(اباجان!) اسے ہمارے ساتھ بھیج دیں تاکہ وہ کچھ مزے اڑا لے اور کچھ کھیل کود کر

لے!'' جہاں تک لھو (غفلت) کا معاملہ ہے تو وہ سن تکلیف (شریعت کے مکلّف ہونے کا زمانہ) کے بعد کا مرحلہ ہے۔ سورۃ الانبیاء میں ارشاد فرمایا: ﴿لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۗ﴾ (آیت ۳) ''ان کے دل غافل ہو گئے اور وہ سرگوشیاں کرتے رہے۔'' یعنی یہ وہ مرحلہ ہے جو انسان کی زندگی میں عہد طفولیت کے بعد آتا ہے اور اکثر لوگوں کے ساتھ زندگی کے آخری سانس تک رہتا ہے۔

اب سورۃ الاعراف کی آیت ملاحظہ ہو جہاں ''لَھْو'' کا ذکر پہلے ہے۔ یہاں مقام الاعراف پر اہلِ ایمان اور کفار کا محاورہ (ڈائیلاگ) دکھایا گیا ہے جہاں اہلِ ایمان کفار کے اس مطالبہ پر کہ ہمیں کچھ پانی پلا دو' کچھ کھانا کھلا دو' انہیں بتا رہے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں اللہ نے کفار پر حرام قرار دے دی ہیں جنھوں نے دین کو لھو اور لعب بنا لیا تھا' یعنی ان کے اس آخری عمل (لَھْو) کا تذکرہ پہلے کیا گیا کہ جس پر انہیں موت آئی تھی۔

سورۃ العنکبوت میں دُنیوی زندگی اور اُخروی زندگی کا تقابل بیان کیا گیا ہے۔ دُنیوی زندگی کے لیے ''حیاۃ'' کا لفظ ہے اور اُخروی زندگی کے لیے الف اور نون کے اضافے کے ساتھ ''لَھِیَ الْحَیَوَانُ'' کے الفاظ لائے گئے۔ عربی لغت کے مطابق زیادتِ الفاظ زیادت معانی پر دلالت کرتے ہیں۔ چونکہ دُنیوی زندگی میں سن تکلیف کے بعد غفلت کے لمحات اور ساعات زیادہ ہوتے ہیں اس لیے ''لَھْو'' کا ذکر پہلے لایا گیا۔

یہ مثالیں اس لیے عرض کی گئیں کہ قرآن کی جتنی بھی غواصی کی جائے اتنے ہی ہیرے اور موتی ملتے ہیں۔ ڈاکٹر فاضل صالح السامرائی کی ساری توجہ اعجازِ قرآن کے اس پہلو کی طرف رہی تو وہ اس فن کے امام ٹھہرے اور عالَمِ عرب میں ان کی خوب پذیرائی ہوئی۔ ''لَمَسَاتِ بیانیه'' کے عنوان سے شارقہ ٹی وی پر ان کا سوال و جواب پر مشتمل پروگرام تمام عرب دنیا کے لیے کئی سالوں تک کشش کا باعث رہا۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کو اللہ تعالیٰ نے اس اعزاز سے نوازا کہ وہ قرآن کے داعیانہ پہلو کو اُجاگر کریں اور اس آیت ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۳﴾﴾ (حٰم السجدۃ) کا مصداق ٹھہریں۔ پھر قرآن ہی کی دعوت کی اساس پر ایک ایسی تنظیم کی آبیاری کریں جو اُن کے بعد بھی اس دعوت کا علَم اٹھائے ہوئے ہے۔ جہاں انہوں نے مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوقِ خمسہ کی بات کی وہاں جہاد کے پانچ مراحل کی طرف بھی توجہ دلائی۔

آغازِ درس ہی میں انہوں نے قرآن حکیم میں سے ایک منتخب نصاب ترتیب دیا' اس رعایت سے کہ قرآن کی دعوت کی اساسات محور کلام بنیں اور سامعین و حاضرین کو اس نصاب کی تکمیل کے بعد آغازِ قرآن سے کتاب اللہ کی تفسیر و تشریح جاننے کا شوق پیدا ہو۔ پھر قرآن کی دعوت کو عام کرنے کے لیے انہوں نے لاہور ہی کیا سارے ملک کے طول و عرض میں دروسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا جس میں ان سے فیض یافتہ طلبہ نے بھی ان کا ہاتھ بٹایا۔ یہ دروس یوں تو سارے سال جاری رہتے لیکن رمضان کی راتوں میں تراویح کی مناسبت سے دوآتشہ ہو جاتے۔

ان کے دروس میں مضامین اور معانی کی جھڑی برستی رہتی۔ تکوینی آیات کے شرح و بسط میں جدید علوم اور

سائنس کی مدد سے وہ انہیں آسان اور قابلِ فہم بناتے نظر آتے۔ جہاں تاریخ جھانکتی نظر آتی اور خاص طور پر جب بنی اسرائیل کا ذکر آتا تو وہ زمانے کی طنابیں کھینچتے نظر آتے۔ بہت سے دقیق اور مشکل فلسفیانہ موضوعات کو انہوں نے اپنی قوت استدلال سے ماءِ زلال بنا کر پیش کیا۔

پاکستان میں نظامِ اسلام کو جمہوریت کی قبا میں روشناس کرانے کے لیے کئی جماعتیں اٹھیں لیکن یہ اعزاز صرف ڈاکٹر اسرار احمدؒ کو حاصل ہوا کہ انہوں نے خلافت یا رجوع الی الخلافت کی اصطلاح کو زبانِ زدِ عام کیا۔ پاکستان کے دولخت ہونے کا حادثہ جان کاہ ہوا ڈاکٹر صاحب نے یہاں بھی قرآن سے رہنمائی لی۔ سورۂ سبا میں ذکر کردہ دو باغوں کی تمثیل کا سہارا لیا جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ کیسے دو سرسبز و شاداب باغات قوم سبا کو عطا کیے گئے تھے‘ لیکن ان کی بداعمالیوں نے انہیں اس انجام تک پہنچایا کہ وہ دونوں ثمر بار باغات ببول‘ جھاڑیوں اور کانٹوں کا عنوان بن گئے۔

وہ پاکستان کو اسلام کا قلعہ جانتے تھے‘ ایسا قلعہ کہ جس میں نقب زنی کے لیے باہر سے اور ’’اندرونِ خانہ‘‘ جس شجر پر بسیرا تھا‘ اُس کی شاخیں کاٹنے والے موجود تھے۔ جہاد کے پانچ محاذوں کا ذکر پہلے آ چکا ہے‘ اور یہ قدرتی بات ہے کہ ہر محاذ کا دفاع ایک فرد یا ایک جماعت کے بس میں نہ تھا اور نہ ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے قرآنی تعلیمات سے جہالت‘ عوام الناس میں رائج بدعات و رسومات‘ سیاسی اکھاڑے میں فساد اور کرپشن کے خلاف محاذ سنبھالے رکھا‘ اور ہر اُس شخص کو جو دین کا کچھ بھی پاس رکھتا ہے اپنی بساط‘ صلاحیتوں اور استعداد کی حد تک کوئی نہ کوئی محاذ سنبھالنے کی طرف توجہ دلائی۔ ان کے دروس اور ارشادات میں احادیث رسول ﷺ نگینہ کی طرح جڑی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے امام نوویؒ کی ’’اربعین‘‘ کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کر کے اسلام کے دوسرے مصدر اساسی کو اپنے خطابات کا موضوع بنایا۔

آخر میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور نظریہ وحدت الوجود کے حوالے سے چند گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں کہ جو معاصر طلبہ اور علماء کے درمیان بڑی شدت سے بحث و تنقید کا موضوع رہی ہیں۔ میں نے یوٹیوب کی مدد سے ڈاکٹر صاحبؒ کی تفسیر سورۃ الحدید (پہلی چھ آیات) پر مشتمل دروس کو بڑے غور سے سنا ہے کہ جو انہوں نے ستمبر/اکتوبر ۱۹۸۷ء میں قرآن اکیڈمی کے پلیٹ فارم سے دیے تھے۔

انہوں نے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود کو صحیح طریقے سے سمجھا نہیں گیا اور اسے نظریہ ’’ہمہ اوست‘‘ جو کہ ایک ہندو فلسفہ ہے‘ سے خلط ملط کر دیا گیا ہے جو کہ یقیناً کھلی گمراہی ہے۔ پھر انہوں نے مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ‘ شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی تحریرات اور فرمودات کی روشنی میں نظریہ وحدت الشہود اور نظریہ توحید وجودی کو اُن کی پیش کردہ تمثیلات کے ذریعہ واضح کیا ہے۔

مجدد سرہندیؒ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ہمیں ’’فتوحاتِ مکیہ‘‘ سے زیادہ فتوحاتِ مدنیہ محبوب ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ابن عربی نے ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں ’’لا عین و لا غیر‘‘ کہہ کر ایک غیر محتاط رویہ اختیار کیا ہے‘ لیکن ساتھ یہ بھی کہا کہ جو کچھ اُن کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے اس میں

اسماعیلیہ اور باطنیہ کی طرف سے مداخلت کا بھی امکان ہے۔

انہوں نے مذکورہ تین شخصیات کے نظریات اور تمثیلات بیان کرنے کے بعد اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ وہ محض فلسفی ذہن رکھنے والے اہلِ علم کی تسلّی وتشفّی کے لیے ان مباحث کو بیان کر رہے ہیں کہ ان کا تعلق عملی زندگی سے نہیں بلکہ صرف فلسفیانہ موشگافیوں سے ہے۔

صفاتِ الٰہی (جو کہ اسماء اللہ الحسنیٰ میں شامل ہیں) کے بارے میں ڈاکٹر صاحبؒ کا دوٹوک موقف ہے کہ وہ صفات جن کا تعلق افعال سے نہیں ہے' جیسے اللہ تعالیٰ کا عرش' ہاتھ' چہرہ' سمع وبصر کا ہونا' یہ سب آیاتِ متشابہات میں سے ہیں کہ ان میں نہ تجسیم کی گنجائش ہے نہ تعطیل وتشبیہ کی' بلکہ ہم ان کا اثبات کرتے ہیں کیونکہ خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کا اثبات کیا ہے' لیکن ہم ان کی کیفیت کو نہیں جانتے۔ انہوں نے بڑی خوبصورت بات کہی کہ ان صفات باری تعالیٰ کا بیان تعلق باللہ کے حوالے سے ہونا چاہیے تا کہ ایک مسلمان اپنی زندگی میں ایمان وایقان کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ پائے۔ اللہ تعالیٰ کی معیت کا احساس اُسے ایک طرف بے پناہ قوت اور ہمت عطا کرتا ہے تو دوسری طرف اسے ''ہوشیار باش'' رہنے کا سبق بھی دیتا ہے۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر صاحبؒ کا درس ایک اچھا تاثر قائم کرتا ہے لیکن چند پہلوؤں سے ایک تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے کہ جن کے ضمن میں مزید وضاحت بہت سے اشکالات کو رفع کر سکتی ہے۔ مَیں ان چند پہلوؤں کا تذکرہ کیے دیتا ہوں:

(۱) جو بات صفات باری تعالیٰ کے بارے میں کہی جا رہی ہے وہی ذات باری تعالیٰ پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ یعنی جیسے ہم اللہ تعالیٰ کو سمیع وبصیر جانتے ہیں ویسے ہی اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق انسان کو بھی سمع وبصر کے وصف سے متصف پاتے ہیں ﴿فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝۲﴾ (الدھر)۔ لیکن کہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا سمیع وبصیر ہونا اور کہاں انسان کی سمع وبصر۔ دونوں میں کوئی مشابہت نہیں۔ اللہ کی صفات لامحدود اور انسان کی انتہا درجے کی محدود' ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝۱۱﴾ (الشوریٰ)

ایسے ہی جب ہم ذات باری تعالیٰ کو واجب الوجود جانتے ہیں تو مخلوق کے وجود کا بھی انکار نہیں کر سکتے مگر دونوں کے وجود میں کوئی نسبت نہیں۔ ایک کا وجود ازلی اور دوسرے کا عارضی۔ لیکن اس عارضیت کا انکار کائنات کی غرض وغایت پر پانی پھیر دیتا ہے کہ وہاں خالق ومخلوق' عابد اور معبود' ربّ اور مربوب کا ذکر عبث ہو کر رہ جاتا ہے۔ ''لا الٰہ الاّ اللّٰہ'' کا تقاضا ''لا معبودَ الا اللّٰہ'' کے حوالے سے ہوتا ہے۔ سلف میں سے کسی نے بھی اسے ''لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ'' سے تعبیر نہیں کیا ہے۔

(۲) ڈاکٹر صاحبؒ نے ایک دوسری خوبصورت بات کہی ہے کہ ذاتِ الٰہی کا ادراک عقلِ انسانی سے بالاتر ہے' یعنی ایک محدود چیز ایک غیر محدود ہستی کا ادراک کیسے کر سکتی ہے! اس لیے ایک مسلمان کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ ذات باری تعالیٰ کے بارے میں فلسفیانہ موشگافیوں کا سہارا نہ لے۔

آیت ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ کی تشریح کے ضمن میں ایک دوسرے موقع پر ڈاکٹر

صاحب کا یہ کہنا کہ یہ وحدت الوجود کے بارے میں نص قطعی ہے، مذکورہ تصریحات کے بالکل منافی ہے۔ سلف صالحین (صحابہ، تابعین، تبع تابعین) بلکہ ائمہ اربعہ میں سے کسی نے بھی یہ بات نہیں کہی ہے۔ ایسے نازک مقام پر سلف کے فہم تک محدود رہنا ہی باعث سلامتی ہے، وگرنہ بقول ڈاکٹر صاحب 'پھسلنے کا امکان رہتا ہے۔

(۳) متشابہات کے ضمن میں امام مالکؒ (یکے از ائمہ سلف) کا قول ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ جب ان سے ایک شخص نے ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا تھا: الاستواء معلوم (یعنی معنی کے اعتبار سے) والکیف مجھول (کیفیت کے اعتبار سے) والسؤال عنہ بدعۃ۔ امام مالک نے جو تین باتیں عرض کی ہیں، ان میں تیسری بات قابل غور ہے کہ دورِ سلف میں ایسے سوال اٹھانا بدعت میں داخل تھا، اس لیے ان باتوں پر غور وخوض کرنے سے اجتناب ہی بہتر ہے۔

(۴) اللہ سبحانہ وتعالیٰ زمان ومکان سے ماوراء ہے، لیکن جیسے آدابِ خداوندی کا لحاظ رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے کئی جگہ ضمیر جمع کا صیغہ، جو کہ ضمیر تعظیم کہلاتا ہے، ذکر کیا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ⑨﴾ (الحجر) ''بے شک ہم ہی نے الذکر (القرآن) کو اُتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''، ویسے ہی اپنے لیے ''الاعلیٰ''، ''العُلیٰ'' اور الفاظِ فوقیت کا بھی اثبات کیا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے لیے جہت علو کے اثبات میں ہچکچاہٹ روا نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے درست کہا کہ انسان کی فطرت میں یہ داخل ہے کہ اللہ کا تصور کرتے وقت اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھتی ہیں، اور پھر نبی ﷺ کی اس ادا کا بھی ذکر کیا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ کے آخر میں آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے انگلی اٹھائی اور کہا: ''اللّٰھُمَّ اشْھَدْ'' اے اللہ گواہ رہنا! (تین مرتبہ ارشاد فرمایا)۔ دعا کے لیے انسان ہتھیلیوں کو اوپر کی طرف اٹھاتا ہے نہ کہ ہاتھ کی پشت کو، یہ اندازِ فطرت بھی ہے اور اتباعِ سُنّت بھی!

(۵) ابن عربی کے عقیدہ وحدۃ الوجود کی صحیح تعبیر کیا ہے؟ کیا وہ مخلوق کے وجود کو صرف سایہ یا عکس کی مانند دیکھتے ہیں یا اس سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں؟ انہوں نے زیادہ تر اپنے افکار کو ''فصوص الحکم'' میں رقم کیا ہے لیکن ''فتوحاتِ مکیہ'' کے پہلے صفحہ پر ہی اپنا یہ قطعہ درج کرکے اپنے عقیدے کی طرف اشارہ کر دیا ہے: ؎

الربُّ حَقٌّ وَالعَبدُ حَقٌّ — یا لیتَ شعری مَن المُکلَّف!
إن قلتُ عبدٌ فذاک مَیتٌ — او قلتُ ربٌّ أنّی یُکلَّف!

''ربّ بھی حق ہے اور بندہ بھی حق ہے تو ہائے! میں کیسے جانوں کہ کون مکلف ہے؟ اگر کہوں کہ بندہ ہے، تو وہ تو مرجانے والا ہے، اور اگر کہوں کہ رب ہے تو اسے کیسے مکلف قرار دیا جائے!''

بالفاظِ ابن تیمیہؒ ابن عربی کے نزدیک وجود تو ایک ہی ہے، اور وجود واجب عین ہے جس پر حق کا فیضان ہوا ہے، اس لیے ہر چیز کا وجود عین وجود حق ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ یہ کلام باطل ہے، اس لیے کہ بندہ تو موجود ہے، ثابت ہے، معدوم نہیں ہے، نہ ہی اس کی نفی کی گئی ہے، لیکن وہ اللہ ہی ہے جس نے اسے ایک ثابت موجود کی شکل دی ہے۔ یہی مسلمانوں کا دین ہے کہ جو کچھ بھی اللہ کے ماسوا ہے وہ اللہ ہی کا پیدا کردہ ہے، اللہ کے ایجاد کرنے سے اس کا

وجود ظہور میں آیا ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کا وجود اللہ کے ایجاد لانے سے نہ ہو (فتاویٰ مجلد ۲: ۱۱۳۔۱۱۵)

’’فصوص الحکم‘‘ میں اسے یوں تعبیر کیا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّمَآ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۸۲﴾﴾ (یٰس) ’’اُس کا امر یہ ہے کہ جب وہ کوئی چیز چاہتا ہے تو اسے کہتا ہے ’’ہو جا‘‘ تو وہ ہو جاتی ہے۔‘‘

یہاں ’’شَیْء‘‘ کا ذکر کیا اور اس سے خطاب کیا کہ ’’ہو جا!‘‘ تو اس کا مطلب ہے کہ ’’شَیْء‘‘ گو معدوم تھی لیکن یہ معدوم جسے اللہ نے پیدا کرنے کا ارادہ کیا وہ اللہ کے علم‘ ارادے اور قدرت میں پہچان رکھتی تھی‘ یعنی اس کی ذات خارج میں ثابت شدہ تھی۔ ابن تیمیہ اس کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کسی چیز کو اپنے تصور میں لانا‘ چاہے ہم اس کی نفی کر رہے ہوں یا اُسے خارج میں ثابت کر رہے ہوں یا اس کے بارے میں متردد ہوں‘ صرف ہمارے تصور کی بنا پر خارج میں اس کا وجود ثابت نہیں ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر ہم یاقوت کے پہاڑ کا‘ یا پارے کے سمندر کا یا سونے کے انسان کا یا پتھر کے گھوڑے کا تصور کریں تو خارج میں وہ ایک وجود کی شکل اختیار نہ کر لے گا‘ کیونکہ علم اور تقدیر میں کسی چیز کے ثابت نظر آنے کا یہ مطلب نہیں کہ خارج میں اس کا عین بھی وجود میں آ گیا ہے۔ یہ عام بات ہے کہ ایک عالم کسی چیز کے بارے میں جانتا ہے‘ پھر اس کے بارے میں بات کرتا ہے اور اسے تحریر میں بھی لے آتا ہے‘ حالانکہ خارج میں نہ اس کا وجود ہوتا ہے اور نہ ہی ثبوت (یہاں ثبوت دلیل کے معنوں میں نہیں‘ بلکہ کسی چیز کے قائم ہونے کے معنیٰ میں ہے)۔

اس لحاظ سے صاحب الفصوص کے نزدیک ان چیزوں کا وجود عین وجود حق ہے‘ کیونکہ یہ ساری اشیاء عدم کے اندر ثابت ہیں اور اس حق کے ساتھ متحد ہیں کہ جو ان کے قیام کا سبب ہے۔ (ص ۱۴۴۔۱۴۵)

چونکہ ابن الفارض جیسے وجودی حلول یا ہمہ اوست کی طرف چلے گئے اور ابن الفارض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ: ؎

وما الکلبُ والخنزیرُ اِلَّا اِلٰهُنا   وما اللّٰهُ اِلَّا فِی الکَنِیسَةِ یُعبَدُ

’’اور کُتّا اور خنزیر کچھ نہیں مگر وہ ہمارے الٰہ ہیں‘ اور جس کی عبادت گرجا میں ہو رہی ہے وہ بھی اللہ ہے۔‘‘

اور اسی بنا پر ابن تیمیہ انصاف سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں:

’’گو ابن عربی کا یہ قول کفر ہے لیکن ان (قائلین وحدت الوجود) میں وہ اسلام سے قریب تر ہیں‘ اس لیے کہ ان کے کلام میں بہت سی چیزیں اچھی بھی ہیں اور اس لیے کہ وہ دوسروں کی طرح اتحاد (یعنی وحدت الوجود) پر اتنے ثابت قدم نہیں ہیں جتنے دوسرے لوگ ہیں‘ بلکہ ان کے نزدیک اس بارے میں کافی اضطراب پایا جاتا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ وہ اپنے بے پایاں خیال کے ساتھ یوں کھڑے ہیں کہ کبھی انہیں حق نظر آتا ہے اور کبھی باطل‘ اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کس عقیدے پر فوت ہوئے۔‘‘ (ص ۱۴۴)

یہاں مَیں اتنا ضرور کہوں گا کہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے عالَمِ امر اور عالَمِ خلق کی بحث میں بارہا کہا ہے کہ عالَمِ امر میں اشیاء کا وجود میں آنا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کلمہ ’’کُن‘‘ کی بنا پر ہے‘ گویا پہلے ان کا وجود نہ تھا اور پھر کلمہ کُن سے

وہ وجود میں آگئیں۔ اس کے برعکس ابن عربی کا سارا زور کلمہ ''شی ء'' پر ہے کہ چونکہ ''شی ء'' سے خطاب کیا گیا تھا (کہ ہوجا) اس لیے وہ شی ء معدوم کی حیثیت سے اپنی ماہیت رکھتی تھی اور وجود ماہیت سے بڑھ کر ایک قدر زائد ہے۔

(۶) مجھے ابن عربی کی ''الفتوحات المکیہ'' اور ''فصوص الحکم'' (دانائی کے نگینے) کے سرسری مطالعے کا موقع ملا ہے جس کی روشنی میں ان دونوں کتابوں کے بارے میں چند مزید گزارشات پیش خدمت ہیں:

ابن عربی (ف ۶۳۸ھ) نے اپنی زیارتِ مکہ مکرمہ کے دوران ''الفُتوحات المکّیۃ'' کی تصنیف کی اور اس بات کا ادعا کیا کہ یہ ساری کی ساری کتاب ایک خواب میں اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے املاء کرائی گئی ہے۔ ان کے نزدیک عقیدے کی تین سطحیں ہیں: عوام الناس کا عقیدہ کہ جس میں وہ جمہور کا مسلک روا رکھتے ہیں' پھر خواص کا عقیدہ جسے وہ اہل الکلام کا عقیدہ قرار دیتے ہیں' پھر اعلیٰ ترین مرتبے پر خلاصۃ الخاصہ کا عقیدہ ہے کہ جس کے وہ خود حامل ہیں۔ یہ وہ عقیدہ ہے جو باطنی' اسماعیلی فرقہ کے عقیدہ ظاہر و باطن کا عکاس ہے اور رموز و اشارات کی زبان میں کتاب کے صفحات پر پھیلا ہوا ہے' لیکن ان کی دوسری کتاب ''فصوص الحکم'' میں ان کی آراء زیادہ وضاحت کے ساتھ آگئی ہیں۔

اس کتاب کی ۲۷ فصلوں میں ہر ایک نبی کے نام کے ساتھ ایک فص (نگینہ) کی نسبت کی گئی ہے۔ ان کے نزدیک انبیاءِ کرام علیہم السلام انسانِ کامل کا مظہر ہیں کہ جن میں حقیقتِ الٰہیہ اپنی کامل ترین شکل میں تجلی اختیار کرتی ہے۔ ہر فص میں ایک نبی کا بیان ہے جس میں حق تعالیٰ کی ایک خاص صفت کا ظہور ہوتا ہے اور پھر اس نبی سے متعلق آیات کی باطنی تفسیر کی گئی ہے۔ جیسے فص ایوبی میں حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم کی یہ آیت پیش کی گئی ہے:

﴿وَاذۡكُرۡ عَبۡدَنَاۤ اَيُّوۡبَ ۘ اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىۡ مَسَّنِىَ الشَّيۡطٰنُ بِنُصۡبٍ وَّعَذَابٍ ﴿۴۱﴾﴾ (ص)

''اور ہمارے بندے ایوب کا بھی ذکر کرو' جب اُس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے شیطان نے رنج اور دکھ پہنچایا ہے۔''

ابن عربی نے اس کا معنی یہ بتایا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے جس درد اور رنج پہنچنے کا ذکر ہے اس سے مراد حجاب اور حقائق سے لاعلمی کا عذاب ہے۔ غرضیکہ ان کے نزدیک ''عقل'' ظاہر کی زبان ہے (یعنی عقیدہ عوام) اور ''ذوق'' باطن کی زبان ہے (یعنی عقیدہ خلاصۃ الخاصۃ) جو کہ ان کا اپنا عقیدہ ہے۔ وحدت الوجود کو انہوں نے مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ ایک تمثیل یہ بیان کی ہے کہ وجودِ عین تو واحد ہے' لیکن جوں جوں عدد بڑھتا چلا جاتا ہے اس میں کثرت نظر آتی ہے لیکن اس کثرت میں عدد واحد برقرار رہتا ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ (حق) اور مخلوق (کائنات) کے درمیان عددِ واحد سے ظاہر ہونے والے مزید اعداد والا تعلق ہے' اور جیسے عددِ واحد نے باقی اعداد کو وجود بخشا اسی طرح ذات حق نے کثرت کی شکل میں کائنات کو وجود بخشا۔

(۷) ڈاکٹر صاحب نے وحدۃ الوجود کی شرح میں انہی تمثیلات کا سہارا لیا ہے لیکن اس بات کی صراحت بھی کی ہے کہ گو مَیں اس رائے سے (نہ کہ عقیدۂ ہمہ اوست سے) اتفاق رکھتا ہوں لیکن میرے مخاطبین کو پورا حق ہے کہ وہ اسے قبول کریں یا مسترد کر دیں۔

مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک داعی الی اللہ کو جانچنے کے لیے اس کی ایک شاذ محتمل التاویل رائے کو معیار نہیں بنانا چاہیے۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ اس شخص کی اسلام کی حمایت، دعوت اور تبلیغ میں کیا خدمات رہی ہیں اور اس لحاظ سے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا قد بہت اونچا ہے۔

پاک وہند میں اور پوری دنیا کے اردو داں طبقے میں قرآن کے آڈیو/ ویڈیو دروس کے حوالے سے جو قبولیت انہوں نے پائی ہے وہ کم ہی کسی دوسرے معاصر عالم کو حاصل رہی ہے۔ مَیں اُن کی علمی، دعوتی اور تحریکی خدمات کے چند عنوانات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

(i) انہوں نے اپنی دعوتی زندگی کا آغاز قرآن فہمی کی تحریک سے کیا۔ پھر اسلامی جمعیت طلبہ، جماعت اسلامی، انجمن خُدّام القرآن اور تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے قرآن کے دروس کو ایک مقبولیت عامہ کی سطح پر پہنچا دیا۔ اس تحریک میں اُن کی ایک اوّلین کتاب ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کا بڑا حصہ ہے۔ قرآنی آیات کی ایک سادہ اور دلنشین تشریح اور تفسیر کے ساتھ ساتھ آیاتِ کونیہ کی سائنسی اکتشافات کے تناظر میں تشریح اور توضیح عصرِ حاضر کے اہلِ علم حضرات کے لیے بہت اطمینان بخش رہی ہے۔ اُمتِ مُسلمہ کے زوال میں انہوں نے درست طور پر ''مہجوریٔ قرآن'' کو ایک بنیادی سبب قرار دیا ہے۔

(ii) جہاد بالقرآن کے پانچ محاذوں کے بیان میں جاہلیت قدیمہ اور جدیدہ کے ساتھ بے یقینی اور تذبذب، نفس پرستی، وساوس اور پھر فرقہ واریت کا تذکرہ ایک علمی جہاد کے مختلف گوشوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس لحاظ سے انہیں امام ابن تیمیہؒ سے زیادہ مناسبت ہے نہ کہ ابن عربیؒ سے۔ مؤخر الذکر کا دامن جہاد کے باب میں بالکل خالی ہے جب کہ اول الذکر نے علمی جہاد کے ساتھ ساتھ عملی جہاد میں بھی حصہ لیا جو بلادِ اسلامیہ پر تاتاری یلغار کے بالمقابل تھا۔

(iii) ملکی سطح پر لبرل ازم، انکارِ سنّت اور ردّ قادیانیت پر ان کی جدّوجہد کافی وزن رکھتی ہے۔ فتنے سے بچاؤ کے لیے جو پانچ اصول انہوں نے بیان کیے ہیں ان میں اسلاف سے مضبوط تعلق سرفہرست ہے۔ فقہی معاملات میں اعتدال کی راہ اور علماءِ حق سے رابطہ ان کی دعوت کا اہم ستون رہا ہے۔

(iv) وہ عبادت کا ایک ہمہ گیر تصور پیش کرتے ہیں جس میں انفرادی اصلاح اور کیفیت احسان کی آبیاری کے ساتھ ساتھ اجتماعی سطح پر خلافت حقہ کو قائم کرنے کی جدّوجُہد نمایاں نظر آتی ہے۔ قومیت کے تصور پر انہوں نے کاری ضرب لگائی ہے۔ موجودہ دور میں اسلامی ریاست کے لیے تھیوڈیموکریسی (Theo-Democracy) کی اصطلاح مولانا مودودیؒ سے مستعار لی ہے اور نظام ریاست کو چلانے کا ایک واضح تصور دیا ہے۔

(v) ایمان کے حقیقی تصور اور قانونی تصور کے بیان کے ضمن میں امام ابوحنیفہؒ کی تعریفِ ''ایمان'' اور جمہور کی

تعریف (definition) میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال انہیں اس بات سے انکار نہیں ہے کہ اعمال کی بنیاد پر ایمان میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔

(vi) حقیقتِ شرک اور اقسامِ شرک پر انہوں نے تفصیلی گفتگو کی ہے۔توحید کے ضمن میں تعلق باللہ ان کی دعوت کا محور رہا ہے۔

بدعت اور مروّجہ تصوف کے مختلف مظاہر کا وہ شدت سے انکار کرتے ہیں جو ایک خوش آئند بات ہے۔سُنّت یا حدیث کے حوالہ سے ''اَربعین نووی'' کا مطالعہ اور اس کی شرح ان کا ایک قابلِ قدر کام ہے۔تاہم اس موضوع پر ان کے شاگردوں اور متوسلین کو مزید کام کرنے کی ضرورت کا احساس رہنا چاہیے۔

ان کی اس جرأت رندانہ کا اعتراف کرنا چاہیے کہ انہوں نے حدِرجم کے بارے میں اپنے استاد اور مربی مولانا امین احسن اصلاحی کے مخالفِ سُنّت موقف کا شدت سے انکار کیا بلکہ ان کے اس موقف کی بنا پر ان سے براءت کا اظہار بھی کیا' لیکن ان کے لیے دعاءِ مغفرت میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

یہ مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے' اس لیے مزید چند عنوانات کے بیان پر اکتفا کرتا ہوں جو ان کے علمی جہاد کی عکاسی کرتے ہیں۔

(۱) سورۂ بنی اسرائیل کی روشنی میں قضیہ فلسطین کو یہود کی پوری تاریخ کے ساتھ اجاگر کیا۔

(۲) ''وحدتِ ادیان'' کے نظریہ پر سخت نکیر کی۔اب چند سالوں سے ''دین ابراہیمی'' کے نام پر اس فکر کو خلیج کے مقتدر حلقوں کی طرف سے پذیرائی مل رہی ہے۔

(۳) صدر ایوب کے جاری کردہ عائلی قوانین کے بارے میں انہوں نے اسلامی فقہی موقف کو نمایاں کیا۔

(۴) اُمت کے پانچ ادوار کے بیان پر مشتمل حدیث کو بہت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

(۵) مساوات' آزادی' اخوت کے نعروں پر مشتمل یورپ اور امریکہ کے دساتیر کے مقابلہ میں نبی مکرم ﷺ کے خطبہ حجۃ الوداع کی اسبقیت اور افضلیت کو آشکار کیا۔

(۶) فکر اقبال کی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے۔

(۷) اپنی ساری دعوتی تحریک کو فریضہ اقامت دین کی ایک عملی تعبیر کی حیثیت سے متعارف کرایا۔

(۸) شدید فقہی جمود کے دور میں اپنے اس منہج کا ببانگ دہل اعلان کیا کہ وہ ائمہ اربعہ کی اجتہادی آراء میں سے کسی ایک رائے کو اختیار کرنے کے مجاز ہوں گے' یعنی کسی ایک امام کی رائے کے پابند نہ ہوں گے۔لیکن اس ضمن میں آٹھ رکعت تراویح پر ان کا اظہارِ تعجب سمجھ سے باہر ہے کہ یہ مسئلہ ائمہ اربعہ سے قبل عہد سلف میں متعارف تھا اور اس پر عمل بھی جاری تھا۔ایسے ہی ان کا شاہ ولی اللہؒ کی بعض شاذ آراء کا حوالہ دینا جیسے ارواحِ اولیاء اللہ کا فرشتوں کی نچلی سطح پر تدبیر امور کے لیے شامل کیا جانا دلیل کا محتاج ہے۔مزید برآں ان کی رائے بابت عالَمِ امر اور عالَمِ خلق اگر امر تکوینی اور امر تشریعی کے حدود میں رہتی تو فہم سلف کی بہتر نمائندگی کرتی۔

خاتمہ کلام

مجھے اپنی زندگی میں منامات (خواب) دیکھنے کا خاطر خواہ حصہ ملا ہے۔ اکثر تو ''اضغاثُ اَحلَام'' کی بنا پر طاقِ نسیاں ہوئے، لیکن کئی خواب ایسے بھی دیکھے جن کی تعبیر روزِ روشن کی طرح سامنے آ گئی۔ پھر کچھ خواب ایسے بھی ہیں جو تعبیر کے محتاج ہیں۔ شاید ڈاکٹر اسرار احمد کے بارے میں اپنا یہ خواب مجھے صفحہ قرطاس پر لانے کی ہمت نہ ہوتی مگر یہ کہ انہی دنوں مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ کی تصنیف ''دبستانِ حدیث'' میں بضمن سوانح عمری محدث مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ (ف ۱۹۳۵ء) ان کا اپنا خواب زیر مطالعہ آیا جس کے آخر میں انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ ''قارئین سے درخواست ہے کہ اگر اس خواب کا شماران کے نزدیک اضغاثُ احلام میں نہیں ہوتا اور یہ تعبیر طلب ہے تو ﴿اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴾ (یوسف)

مجھے اپنا یہ خواب یاد نہ تھا، لیکن مَیں چونکہ اسے اپنی ڈائری میں قلم بند کر چکا تھا اس لیے اس کی حکایت میرے لیے آسان ہوگئی۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی وفات ۱۴/اپریل ۲۰۱۰ء کی صبح کو ہوئی۔ میں نے یہ خواب پورے چار ماہ بعد ۱۵/اگست اتوار کی صبح کو دیکھا تھا۔

مَیں نے ڈاکٹر صاحب کو سفید کپڑوں میں ملبوس دیکھا اور جیسے وہ ایک تخت پر تشریف فرما ہیں۔ میرے ہاتھ میں ایک تختی ہے، گویا کہ وہ ان کی سرجری کی تختی ہے۔ اوپر کسی سطر میں عربی عبارت لکھی ہے اور پھر اگلی سطر میں مَیں خود لفظ (Fee) انگریزی میں تحریر کرتا ہوں۔ اس کے بعد مَیں وہاں ان کا نام اور پھر اپنا نام لکھنا چاہ رہا ہوں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ ہم ہر آنے والے پر ۵۰ کی فیس پہلی وزٹ پر لگائیں گے اور اس کے بعد اگر وہ دوبارہ آئے تو ہم کوئی فیس چارج نہ کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہم عام طور پر ہر وزٹ کا چارج کرتے ہیں۔ پھر مجھ سے کہا: اپنے نام کے ساتھ ''فارغ التحصیل جامعہ اسلامیہ'' بھی تحریر کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے نام کے تحت لکھ دوں ''فیس ۳۰ ہے''۔ اور اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔

مَیں اس خواب کو اس لحاظ سے ایک بشارت سمجھتا ہوں کہ انہیں ایک تخت پر سفید لباس میں ملبوس دیکھتا ہوں۔ باقی رہی تختی اور فیس کی بات تو شاید اس کا تعلق شریعت کونسل (لندن) کے انتظامی امور سے ہو کہ وہاں عائلی مسائل کو نمٹانے کے لیے تھوڑی بہت فیس لی جاتی ہے جو مذکورہ رقوم کی عکاسی کرتی ہے۔ واللہ اعلم!

آخر میں عرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کے لیے کوئی مال و متاع چھوڑ کر نہیں گئے، صرف دین ہی کو بطور ورثہ چھوڑ گئے۔ اللہ سے قوی امید ہے کہ ان کی بے پایاں حسنات کے طفیل وہ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائیں گے، اعلاء کلمۃ اللہ اور قرآن کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے ان کے عظیم کام کو قبولیت سے نوازیں گے اور ان کے لگائے ہوئے صدقۂ جاریہ کو ان کے لیے توشۂ آخرت بنا دیں گے۔

وَصَلَّى اللّٰه تعالىٰ على نبينا محمد وعلىٰ آله وصحبه وَسَلَّم

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے منہجِ تفسیر میں نظمِ قرآن کی اہمیت اور استعمالات

ڈاکٹر صاحبزادہ باز محمد ☆

عبدالسلام ☆☆

Abstract

The complete Quran was revealed over a period of 22 years, portion by portion as and when it was required. The sequence of the ayaat as they appear in the Mushaf is different from its chronological order of revelations. Most of the surahs in the Quran form pairs, because of the similarities of the subjects addressed in them. There are also some unique surahs which don't form a pair with any surah. The surahs have also been divided into seven Makkan-Madinan groups; each group starting with one or more Makkan surahs and ending with one or more Madinan surahs. Every group has a central theme.

In Doctor Israr Ahmad's Manhaj-e-Tafseer, Nazm-e-Quran has primary importance. He explains the relation between surahs and the ayahs before every surah. He forms pairs because of the similarities of the subjects addressed in these surahs.

I have tried my level best to explain the importance and uses of Nazm-e-Quran in his method of Tafseer.

Key words: *revealed, similarities, pairs, groups, central subject.*

ابتدائیہ

محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ (۱۹۳۲ء تا ۲۰۱۰ء) ان خوش نصیب انسانوں میں سے تھے جنہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے کلام عزیز کی خدمت کے لیے چُن لیا تھا۔ آپؒ نے ساری عمر قرآن پاک پڑھنے پڑھانے میں صَرف کر دی۔ آپؒ کے منہجِ تفسیر کی یہ خوبی ہے کہ اس میں اسلاف کی ''اصل ثابت'' سے بھی رشتہ قائم رہتا ہے اور دورِ

☆ چیئرمین شعبہ علوم اسلامیہ، بلوچستان یونیورسٹی۔ ☆☆ ایم فل سکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، بلوچستان یونیورسٹی

جدید کے جملہ مسائل کا حل بھی قرآن پاک کی روشنی میں سامنے آتا ہے۔ یعنی آپؒ تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرائے (محمود) کی حدود میں رہتے ہوئے، دورِ جدید کے محاورے اور اسلوب کو اعلیٰ علمی سطح پر استعمال فرماتے ہیں۔ چنانچہ آپؒ کے طرزِ تفسیر میں شیخ الہندؒ کی جامعیت، ابوالکلام آزادؒ کی ادبیت، مولانا مودودیؒ کی تحریکیت، علامہ اقبال کی ملّی شاعری و فلسفہ، ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے جدید فلسفیانہ افکار اور دورِ حاضر کی سائنس کے ساتھ ساتھ مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحیؒ کے نظم قرآن کا استعمال بھی کثرت سے ملتا ہے۔

آپؒ نے نظمِ قرآن کا مجموعی ڈھانچا مولانا فراہیؒ اور ان کے شاگرد رشید مولانا اصلاحیؒ سے لیا تھا (البتہ آپؒ نے مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحی کے تفردات سے بچتے ہوئے اس کا استعمال فرمایا ہے، اور اس میں کہیں کہیں کمی بیشی بھی فرمائی ہے)۔ نظم قرآن کے اس تصور کو اس خوبی سے اپنے منہج تفسیر میں استعمال فرمایا ہے کہ جہاں اس سے حکمت ومعرفت قرآنی کے نئے نئے موتی سامنے آتے ہیں، وہیں یہ آپؒ کی تفسیر کا جزوِ لاینفک بن گیا ہے۔ ذیل میں ہم نے آپؒ کے منہج تفسیر میں نظم قرآن کی اہمیت اور استعمالات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ واللّٰہ المعین والمستعان۔

نظم ومناسبہ کے لغوی معنیٰ

نظم: منظم کرنا[1] 'نظمًا ونظامًا اللؤلوء'[2]: موتی پرونا' اور مناسبت کے معنیٰ' ناسبہ مناسبۃ:[3] مشابہ ہونا' مناسب ہونا' تعلق' تقریب۔[4]

المناسبة فی اللغة المشاكلة والمقاربة

''لغت میں مناسبت سے مراد مشاکلت ومقاربت ہیں۔''[5]

والمناسبة فی اللغة: المقاربة، يقال فلان يناسب فلانًا ای يقرب منه ويشاكله

''لغوی طور پر مقاربت کسی شخص کی دوسرے سے مناسبت ومشاکلت رکھنے کو کہتے ہیں۔''[6]

نظم ومناسبہ کے اصطلاحی معنیٰ

واما فی الاصطلاح علمٌ يبحث فی المعانی الرابطة بين الآيات بعضها ببعض، وبين السور بعضها ببعض، حتی تُعرف عللُ ترتيب اجزاء القرآن الكريم[7]

''اصطلاحاً اس علم سے مراد یہ ہے کہ ایسا علم جس میں آیات کے باہمی ربط وتعلق اور سورتوں کے مابین ربط و تعلق کی بحث کی جائے یہاں تک کہ قرآن کریم کے اجزاء کی ترتیب کی وجوہات سمجھ آجائیں۔''

والمراد بالمناسبة هنا: وجه الارتباط بين الجملة والجملة فی الآية الواحدة أو بين الآية والآية فی الآيات المتعددة، او بين السورة والسورة۔[8]

''مناسبت سے مراد ایک آیت میں جملوں کا ربط یا آیات کا آیات سے ربط یا سورتوں کا سورتوں سے ربط و تعلق واضح کرنا ہے۔''

علم مناسبت کا موضوع اور ضرورت واہمیت

اس علم کا موضوع قرآن کریم اور اس کی سورتیں اور آیات ہیں۔ یعنی قرآن کریم کی سورتوں کا باہم متصل و

مربوط ہونا‘ ایک سورت کا اپنی ماقبل اور مابعد سورت سے ربط واتصال واضح کرنا اور آیات کے مابین ارتباط کو ظاہر کرنا کہ جس سے کلام الٰہی ایک وحدتِ کُلّی کے طور پر سامنے آجائے۔ علّامہ حمید الدین فراہیؒ رقم طراز ہیں:

فمرادنا بالنظام ان تکون السورة کاملًا واحدًا، ثم تکون ذات مناسبة بالسورة السابقة واللاحقة، او بالتی قبلها او بعدها علی بعد ما، کما قدمنا فی نظم الآیات بعضها مع بعض، فیمکن ان الآیات ربما تکون معترضة، فکذلک ربما تکون السورة معترضة، علی هذا الاصل تری القرآن کله کلامًا واحدًا، ذا مناسبة وترتیب فی اجزاءه من اول الی الآخر۔ (۹)

”نظم سے ہماری مراد سورة کے اجزاء کی ایسی مناسبت ہے جس سے پوری سورة ایک وحدت میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے‘ پھر سورة کی مناسبت سابق اور ملحق سورتوں اور پہلی اور بعد میں آنے والی سورتوں سے واضح ہوجاتی ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ جیسے بعض آیات جملہ معترضہ کے طور پر کلام میں آجاتی ہیں ایسے ہی بعض سورتیں بھی آتی ہوں‘ البتہ نظم واضح ہوجانے کے بعد اوّل سے آخر تک پورا قرآن مناسبت وترتیب رکھنے والا وحدت سے متصف کلام نظر آئے گا۔“

عادل بن محمد ابو العلاء اپنی تحریر ”مصابیح الدرر فی تناسب آیات القرآن الکریم والسور“ میں لکھتے ہیں:

فاننا ندرک ان موضوع علم المناسبة هو آیات القرآن الکریم وسوره، من حیث بیان اتصالها وتلاحمها، بما یظهر اجزاء الکلام متصلة، آخذا بعضها باعناق بعض، ما یقوی بادراکه ادراک الارتباط العام بین اجزاء الکتاب الکریم، ویصیر حال التالیف الالهی کحال البناء المحکم المتناسق الاجزاء (۱۰)

اس علم کی ضرورت واہمیت اس وجہ سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ مصحف کی موجودہ ترتیب نزولی نہیں بلکہ توقیفی ہے‘ اس لیے آیات وسورتوں میں نظم و ربط سمجھنا ضروری ہوجاتا ہے اور اس سے اعجازِ قرآن میں بلاغت‘ بیان اور انتظامِ کلام کے ساتھ ساتھ اسالیب قرآن کے پہلوؤں کا سمجھنا آسان تر ہوجاتا ہے۔

ولمعرفة المناسبة فائدتها فی ادراک اتساق المعانی، واعجاز القرآن البلاغی، واحکام بیانه، وانتظام کلامه، وروعة اسلوبه ﴿كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ①﴾ (۱۱)

قرآن کریم کی سورتوں اور آیات کے درمیان ربط ومناسبت کبھی واضح اور نمایاں ہوتا ہے‘ کبھی چھپا ہوا ہوتا ہے اور کبھی انتہائی پوشیدہ ہوتا ہے کہ دِقّتِ نظر اور مسلسل غور وفکر کرنے سے ہی معلوم کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح سورتیں اپنے مضمون‘ اسلوب اور مزاج کے اعتبار سے جوڑے کی صورت میں بھی ہوتی ہیں اور کبھی کوئی سورت منفرد بھی ہوتی ہے۔ آیات میں ایک آیت دوسری آیت کے اجمال کی تفصیل یا بیان‘ حصر اور استثناء کے لیے آتی ہے‘ یا پھر مثال‘ تشبیہ‘ تکرار‘ مضادہ‘ استطراد اور حسن التخلص کے لیے ہوتی ہیں۔ آیت میں جملوں کے باہمی ربط‘ آیات کے باہمی ربط‘ ماقبل ومابعد کی آیات سے ربط وتعلق ان سب امور کو مدِّنظر رکھ کر نظم ومناسبت اور حسن کلام کو واضح کیا جاتا ہے۔ (۱۲)

علّامہ فراہی اس بارے میں رقم طراز ہیں:

’’قرآن مجید میں ایک ہی چیز کبھی عمود کی حیثیت سے آتی ہے‘ کبھی ضمنی مضمون کی حیثیت سے۔ کبھی وہی چیز اجمال کے ساتھ آتی ہے‘ کبھی تفصیل کے ساتھ۔ کبھی ایک چیز مؤخر ہوتی ہے‘ کبھی مقدم۔ کبھی تنہا ہوتی ہے‘ کبھی اپنے مقابل کے ساتھ۔ کبھی کسی چیز کے ساتھ اس کا جوڑ ہوتا ہے‘ کبھی کسی چیز کے ساتھ۔ بالکل یکساں مضمون مختلف سورتوں میں مختلف ترتیبوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک ہی شے اپنے مختلف پہلوؤں سے تمہارے سامنے جلوہ گر ہوگی تو اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے اور پوری طرح پہچان لینے میں تمہیں دِقت نہیں ہوگی۔ اگر ایک ادا سے نگاہ چوک گئی‘ دوسرا جلوہ سامنے آجائے گا۔ قرآن مجید کی اسی صفت کو ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے: ﴿اُنۡظُرۡ کَیۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَفۡقَہُوۡنَ ﴿۶۵﴾﴾ ‘‘(۱۳)

محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنے منہجِ تفسیر میں جس لحاظ سے نظمِ قرآن کی ترتیب قائم فرمائی ہے وہ کچھ یوں ہے:

سورتوں کے گروپس

(۱) معنوی اعتبار سے مکی مدنی سورتوں کے سات گروپس

(۲) ہر گروپ کا مرکزی مضمون اور مرکزی مضمون کا ربط و تدریج

(۳) گروپ میں شامل سورتوں کا اپنے گروپ کے مرکزی مضمون سے ربط و تعلق

☆ سورتوں کی نسبتِ زوجیت (الربط بین السور) میں جن امور کو مدِّنظر رکھا گیا ہے:

(۱) سورتوں کے فواتح وخواتیم سور میں ربط و تعلق

(۲) حروف مقطعات کے ساتھ اور ان کے بغیر آغاز کرنے والی سورتیں اور ان میں معنوی ربط

(۳) سورت کے نام کی اپنے مضمون سے مناسبت

(۴) سورتوں کے مضامین کی باہمی مناسبت اور تدریجی تکمیل

(۵) آیات کی تعداد‘ سورت کے حجم اور تقسیم آیات میں مناسبت

(۶) سورتوں کے اسالیب میں یکسانیت کے پہلو

(۷) سورت کا صوتی آہنگ

(۸) گروپ کے مضمون کے ساتھ سورت کے مضمون کا ربط

(۹) دو سورتوں میں دو مختلف پہلوؤں سے مضمون کی تکمیل کا انداز

☆ سورتوں کے داخلی نظم میں پیشِ نظر امور

(۱) سورت کا عمود یا مرکزی مضمون

(۲) آیات کا عمود سے ربط و تعلق اور معرفت کے نئے پہلو

(۳) آیات کا باہمی ربط و تعلق

(۴) سورت کا حجم و ترتیب و تقسیم آیات

(۵) سورت کی اپنے نام سے مناسبت

(۶) آیات کا صوتی آہنگ اور ردھم

(۷) اسلوب سورت اور اس کا مضمون سے ربط

ذیل میں ہم کچھ مختصر مثالیں درج کریں گے تاکہ ڈاکٹر صاحبؒ کے منہجِ تفسیر میں نظمِ قرآن کے استعمالات واضح ہو سکیں۔

سورتوں کے گروپس

''بیان القرآن'' میں محترم ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے ہیں:

''تلاوت کے لیے سات منزلوں کے علاوہ قرآن حکیم میں سورتوں کی ایک معنوی گروپنگ بھی ہے۔ اس اعتبار سے بھی سورتوں کے سات گروپ ہیں اور ہر گروپ میں مکی اور مدنی دونوں طرح کی سورتیں شامل ہیں۔ ہر گروپ میں ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتیں اور اس کے بعد ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتیں ہیں۔ ایک گروپ کی مکی اور مدنی سورتوں میں وہی نسبت ہے جو ایک جوڑے کی دو سورتوں میں ہوتی ہے۔ جیسے ایک مضمون کی تکمیل ایک جوڑے کی سورتوں میں ہوتی ہے، یعنی ایک رخ ایک فرد میں اور دوسرا رخ دوسرے فرد میں، اسی طرح ہر گروپ کا مرکزی مضمون اور عمود ہے جس کا ایک رخ مکی سورتوں میں اور دوسرا رخ مدنی سورتوں میں آجاتا ہے۔''(۱۴)

ذیل میں ہم گروپوں کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں:

''سب سے بڑا گروپ پہلا ہے جس میں مکی سورت صرف ایک ہے یعنی سورۃ الفاتحہ جبکہ مدنی سورتیں چار ہیں جو سوا چھ پاروں پر پھیلی ہوئی ہیں، یعنی سورۃ البقرہ، آل عمران، النساء اور المائدۃ۔

دوسرا گروپ اس اعتبار سے متوازن ہے کہ اس میں دو سورتیں مکی اور دو مدنی ہیں۔ سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف مکی ہیں، جبکہ سورۃ الانفال اور سورۃ التوبۃ مدنی ہیں۔

تیسرے گروپ میں سورۃ یونس سے سورۃ المؤمنون تک چودہ مکی سورتیں ہیں۔ یہ تقریباً سات پارے بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک مدنی سورت سورۃ النور ہے۔

چوتھے گروپ میں سورۃ الفرقان سے سورۃ السجدۃ تک مکیات ہیں۔ پھر ایک مدنی سورت سورۃ الاحزاب ہے۔

پانچویں گروپ میں سورۃ سبا سے سورۃ الاحقاف تک مکیات ہیں۔ پھر تین مدنی سورتیں سورۃ محمد، سورۃ الفتح اور سورۃ الحجرات ہیں۔

چھٹے گروپ میں سورۃ قٓ سے سورۃ الواقعۃ تک سات مکیات ہیں۔ ان کے بعد دس مدنیات ہیں: سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم۔

ساتویں گروپ میں بھی پہلے مکی سورتیں ہیں اور آخر میں دو مدنی سورتیں ہیں۔

اس طرح یہ سات گروپ بنتے ہیں۔''(۱۵)

گروپس کے مضامین‘ اور ان کا باہمی ربط و تعلق

☆ پہلا گروپ (سورۃ الفاتحہ: مکی‘ سورۃ البقرۃ تا سورۃ المائدۃ: ۴ مدنیات)

اس گروپ کے مضامین و معنوی ربط و تعلق کی تفصیل ڈاکٹر صاحبؒ کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> ”اس گروپ میں جو مکی سورت ہے وہ صرف سورۃ الفاتحہ ہے۔ یہ حجم کے اعتبار سے بہت چھوٹی لیکن اپنے مقام و مرتبہ اور فضیلت کے لحاظ سے بہت بڑی ہے‘ یہاں تک کہ اسے ”القرآن العظیم“ بھی کہا گیا ہے۔ گویا یہ اپنی جگہ پر خود ایک قرآن عظیم ہے..... سورۃ الفاتحہ منفرد ہے‘ اس کا کوئی جوڑا نہیں ہے..... سورۃ الفاتحہ کے بعد جو چار سورتیں ہیں یہ جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ سورۃ البقرۃ اور سورۃ آل عمران ایک جوڑا ہے جبکہ سورۃ النساء اور المائدۃ دوسرا جوڑا ہے۔“ (۱۶)

پہلے گروپ کے مضامین

اس گروپ میں شامل واحد مکی سورت ”سورۃ الفاتحہ“ اپنے اسلوب کے اعتبار سے دعائیہ ہے‘ جس میں انسان گھٹنے ٹیک کر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے حضور ہدایت اور سیدھے راستے کی دعا کرتا ہے۔ وہ راستہ جو منعم علیہم کا ہو نہ کہ ان کا جن پر غضب ہوا اور جو گمراہ ہوئے۔ اسی دُعا کا جواب پورے قرآن مجید کی شکل میں عطا فرمایا گیا ہے۔(۱۷) البتہ پہلے گروپ کی مدنی سورتوں کے دو مضامین ہیں جو ان میں متوازی چلتے ہیں:

(۱) پہلا مضمون شریعت اسلامی کا ہے‘ یعنی ان سورتوں میں شریعت کا بنیادی ڈھانچا دے کر رفتہ رفتہ تکمیل کی طرف لے جایا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے ہیں:

> ”تو بلیو پرنٹ جو ہے شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا وہ سورۃ البقرۃ میں ہے‘ پھر سورۃ النساء میں اس کے اندر مزید اضافہ ہوتا ہے‘ اور سورۃ المائدۃ میں شریعت کے تکمیلی احکام آتے ہیں۔“

(۲) دوسرا مضمون ہے اہلِ کتاب سے خطاب۔ سورۃ البقرۃ میں یہود اور سورۃ آلِ عمران میں نصاریٰ سے خطاب ہے۔(۱۸)

☆ دوسرا گروپ (سورۃ الانعام و سورۃ الاعراف: مکیات‘ سورۃ الانفال و سورۃ التوبۃ: مدنیات)

دوسرے گروپ کا مرکزی مضمون ایمان بالرسالت ہے(۱۹)۔ ڈاکٹر صاحبؒ اس گروپ کے مضامین کا ربط یوں بیان فرماتے ہیں:

> ”اس گروپ کی چاروں سورتوں میں معنوی ربط یوں ہے کہ پہلی دو مکی سورتوں (الانعام اور الاعراف) میں مشرکینِ عرب پر رسول اللہ ﷺ کی مسلسل دعوت کے ذریعے اتمامِ حُجت ہوا اور بعد کی دو مدنی سورتوں (الانفال اور التوبۃ) میں اس اتمامِ حجت کے جواب میں ان لوگوں پر عذاب کا تذکرہ ہے۔ موضوع کی اس مناسبت کی بنا پر یہ چاروں سورتیں دو دو کے دو جوڑوں کے ساتھ ایک گروپ بناتی ہیں۔“(۲۰)

☆ تیسرا گروپ (سورۃ یونس تا سورۃ المؤمنون: ۱۴ مکیات‘ سورۃ النور: ایک مدنی)

اس گروپ کا مرکزی مضمون بھی ایمان بالرسالت ہے۔ ان سورتوں میں چودہ مکیات ہیں۔ ان میں اکثر

وبیشتر تین تین سورتوں کے ذیلی گروپ بھی بنتے ہیں، جن میں پہلی دو سورتیں جوڑے کی شکل میں ہوتی ہیں جبکہ تیسری سورت مضمون کے اعتبار سے منفرد ہوتی ہے۔ اس گروپ میں انباء الرسل کا خاص بیان ملتا ہے، جن میں قوموں کی رسولوں کے ساتھ رد وقدح، اور رسولوں کی طرف سے اتمامِ حُجّت اور عذابِ الٰہی کا ذکر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ التذکیر بالآء اللہ اور التذکیر بایام اللہ کا بیان ہے۔ سورۃ یوسف اپنے مزاج کے اعتبار سے منفرد ہے اور اس میں قصص النبیین میں حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا ہے۔[21] مدنی سورت النور میں معاشرتی احکامات خصوصاً ستر وحجاب اور استیذان کا بیان ہے مگر شروع سورہ میں ایک خاص واقعہ کے پس منظر میں حدودِ زنا وقذف کا بیان ہوا ہے۔[22]

☆ چوتھا گروپ: (سورۃ الفرقان تا سورۃ السجدہ: ۸ مکیات، سورۃ الاحزاب: ایک مدنی)

چوتھے گروپ کا مرکزی مضمون توحید ہے۔[23] اس گروپ میں شامل مدنی سورت الاحزاب ہے جو معنوی اعتبار سے سورۃ النور کا جوڑا ہے۔ اس میں اسلام کے معاشرتی احکامات کا بیان ملتا ہے۔[24]

☆ پانچواں گروپ (سورۃ سبا تا سورۃ الاحقاف: ۱۳ مکیات، سورۂ محمد تا سورۃ الحجرات: ۳ مدنیات)

اس گروپ کا مرکزی مضمون بھی ایمان باللہ یعنی توحید ہے اور خصوصاً توحید عملی کو "مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔ خاص طور پر سورۃ الزمر اور سورۃ المؤمن میں یہ مضمون دو پہلوؤں سے بیان ہوتا ہے جن میں ایک توحید فی العبادۃ اور دوسرا توحید فی الدعاء کا ہے۔ پھر یہ مضمون تدریجاً فرد سے اجتماعیت کی طرف بڑھتا ہے۔[25]

ڈاکٹر صاحبؒ رقم طراز ہیں:

"ان سورتوں میں "توحید عملی" کے تقاضوں کو ایک فرد سے تدریجاً اجتماعیت کی طرف بڑھایا گیا ہے۔ سب سے پہلے سورۃ الزمر میں توحید عملی کے ظاہری پہلو (عبادت) پر زور دیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کی عبادت کرو اپنی اطاعت کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ پھر سورۃ المومن میں توحید عملی کے داخلی پہلو یعنی دعا کے بارے میں تاکید آئی ہے۔ سورۃ الزمر میں "فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ" کے الفاظ کی تکرار ہے جبکہ سورۃ المومن میں "فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" کے الفاظ بار بار دہرائے گئے ہیں۔ اس طرح ان دونوں میں توحید عملی کو عبادت اور دعا کی صورت میں معاشرے کے پہلے درجے یعنی انفرادی سطح پر متعارف کرایا گیا ہے۔ پھر سورۂ حٰم السجدۃ میں دعوت توحید کی ترغیب دی گئی ہے تاکہ دعوت وتبلیغ کی بھرپور تحریک کے ذریعے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو توحید کا قائل کیا جائے اور ان کے دلوں میں توحید کا سبق جاگزیں کرایا جائے۔ پھر جب لوگوں کی ایک معقول تعداد عملی طور پر توحید پر کاربند ہو جائے تو ان کو منظم کر کے نظام توحید کے قیام کی جدوجہد کے لیے تیار کیا جائے۔ اس ترتیب کے حوالے سے ہم دیکھیں گے کہ سورۂ حٰم السجدۃ میں دعوتِ توحید کی بات ہو گی اور پھر سورۃ الشوریٰ میں معاشرے کے اندر اجتماعی طور پر نظام توحید کے قیام (اقامتِ دین) کا حوالہ آئے گا۔ اس گروپ کی مدنیات میں سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرحلہ اقدام کے آغاز کا ذکر ہے اور سورۃ الفتح میں تکمیل کا۔ سورۃ الحجرات میں قائم ہونے والی اسلامی ریاست کا آئینی ڈھانچا و اصول دیے گئے ہیں۔"[26]

☆ چھٹا گروپ : (سورۂ ق تا سورۃ الواقعۃ : ۷ مکیات‘ سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم : ۱۰ مدنیات)

آخری دوگروپس کا مرکزی مضمون ایمان بالآخرۃ یعنی التذکیر بالموت و مابعدہ ہے۔ البتہ چھٹے گروپ میں شامل دس مدنیات سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم اُمتِ مُسلمہ سے خطاب کے ضمن میں اہم ترین مقام ہیں۔ محترم ڈاکٹر صاحبؒ ان سورتوں سے خصوصی شغف رکھتے تھے۔ آپؒ نے ’’مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب‘‘ میں ان سورتوں کو شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ آپ رقم طراز ہیں:

’’اس ضمنی گروپ میں دس مدنی سورتیں ہیں۔ ان سورتوں کا حجم تقریباً سوا چار پارے کے برابر ہے‘ لیکن تعداد کے اعتبار سے یہ پورے قرآن میں مدنی سورتوں کا سب سے بڑا گلدستہ ہے...... ان مدنی سورتوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے پانچ سورتوں کا آغاز سَبَّحَ لِلّٰہِ یا یُسَبِّحُ لِلّٰہِ سے ہوتا ہے‘ یعنی ان کے آغاز میں اللہ کی تسبیح کا ذکر فعل ماضی میں بھی ہے اور فعل مضارع میں بھی —— گویا پورے زمانے کا کلی طور پر احاطہ ہوگیا ہے کہ آسمانوں اور زمین کے اندر جو چیز بھی ہے اس نے ہمیشہ اللہ کی تسبیح بیان کی ہے‘ ہر چیز اب بھی اس کی تسبیح بیان کر رہی ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ اس کی تسبیح کرتی رہے گی...... ان مدنی سورتوں کے بارے میں تیسری اہم بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ یہ سب سورتیں (سوائے سورۃ التغابن کے) آنحضور ﷺ کے مدنی دور کے نصف آخر میں یعنی سن پانچ ہجری کے بعد نازل ہوئیں۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں کی صفوں میں جوش جہاد‘ ذوق شہادت‘ جذبہ انفاق وغیرہ کے حوالے سے بحیثیت مجموعی ضعف و اضمحلال کے آثار نمایاں ہو رہے تھے...... بہرحال واقعہ یہ ہے کہ ان دس سورتوں میں پورے قرآن کے مضامین کا عطر کشید کر کے رکھ دیا گیا ہے۔‘‘(۲۷)

☆ ساتواں گروپ (سورۃ الملک تا سورۃ الاخلاص : ۴۶ مکیات‘ معوذتین : ۲ مدنیات)

اس گروپ کا مرکزی مضمون ایمان بالآخرۃ ہے۔ اس گروپ میں اکثر و بیشتر سورتیں وہ ہیں جو ابتدائی مکیات میں سے ہیں‘ جن میں آخرت کے حوالے سے جھنجھوڑنے کا انداز نمایاں ہے۔(۲۸)

سورتوں میں نسبتِ زوجیت

’’بیان القرآن‘‘ میں محترم ڈاکٹر صاحب نے جہاں ہر گروپ کے مضمون‘ اس کے عمود اور سورتوں کے باہمی ربط کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا ہے‘ وہیں ہر سورہ کے آغاز میں ہی دوسری سورت کے ساتھ اس کی نسبتِ زوجیت کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آپ دورانِ تفسیر جابجا اس نسبت کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔

نسبتِ زوجیت سے مراد:

’’دو جنسوں یا دو چیزوں کے مابین نسبتِ زوجیت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بعض پہلوؤں سے ان میں باہم مشابہت ہونے کے علاوہ دونوں ایک دوسرے کے لیے تکمیلی خصوصیت کی حامل ہیں‘ یعنی دونوں مل کر کسی خاص مقصد کی تکمیل کرتی ہیں۔‘‘(۲۹)

سورتوں کی باہمی نسبت سے متعلق آپؒ رقم طراز ہیں:

’’قرآن حکیم کی سورتوں کے جوڑے ہونے کا معاملہ قرآن مجید میں بعض جگہوں پر تو بہت ہی نمایاں ہے۔

’’المعوذتین‘‘ آخری دو سورتیں ہیں جو تعوذ پر مشتمل ہیں: قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ ۙ﴿۱﴾ اور قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾۔ اسی طرح ’’الزہراوین‘‘ دو نہایت تابناک سورتیں‘ سورۃ البقرۃ اور سورۃ آل عمرآن ہیں۔ حضور ﷺ نے ان دونوں کو بھی ایک نام دیا۔ اسی طرح سورۃ المزمل و سورۃ المدثر اور سورۃ الضحیٰ و سورۃ الم نشرح میں معنوی ربط ہے۔ سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم میں تو یہ ربط بہت ہی نمایاں ہے۔ دونوں سورتوں کا آغاز بالکل ایک جیسا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ اَحۡصُوا الۡعِدَّةَ ۚ﴾ (الطلاق) اور ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ﴾ (التحریم)۔ مضمون کے اندر بھی بڑی گہری مناسبت ہے۔ اس کے بعد سورۃ الصف اور سورۃ الجمعۃ کا جوڑا ہے۔ سورۃ الصف سَبَّحَ لِلّٰهِ سے اور سورۃ الجمعہ یُسَبِّحُ لِلّٰهِ کے الفاظ سے شروع ہو رہی ہے۔ سورۃ الصف کی مرکزی آیت جو رسول اللہ ﷺ کے مقصدِ بعثت کو معین کر رہی ہے ﴿هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ﴾ (آیت ۹) ہے جبکہ سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت جو حضور ﷺ کے انقلاب کا اساسی منہاج معین کر رہی ہے ﴿هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیۡهِمۡ وَ یُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ ۚ﴾ (آیت ۲) ہے۔

بہر حال سورتوں کا جوڑا ہونا‘ سورتوں کا گروپ کی شکل میں ہونا‘ ان گروپس کا اپنا ایک عمود اور ایک مرکزی مضمون ہونا‘ پھر اس کے دو رخ بن جانا جو اس کی مکیات اور مدنیات میں آتے ہیں‘ قرآن مجید کے علم و حکمت کے خزانے کے وہ دروازے ہیں جو اب کھلے ہیں۔‘‘ (۳۰)

ذیل میں ہم ’’بیان القرآن‘‘ سے سورتوں کے جوڑے ہونے کی نسبت کو مختلف مقامات سے بطور امثال درج کرتے ہیں تاکہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ آں محترمؒ نے اپنے منہجِ تفسیر میں نظمِ قرآن کو کیسے ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔

سورۃ البقرۃ اور سورۃ آلِ عمران میں نسبتِ زوجیت

سورۃ البقرۃ کے آغاز میں لکھتے ہیں: ’’سورۃ البقرۃ اور سورہ آل عمران کا یہ جو جوڑا ہے‘ ان دونوں کو رسول اللہ ﷺ نے ’’الزہراوین‘‘ کا نام عطا فرمایا ہے — یعنی دو انتہائی تابناک اور روشن سورتیں۔ اس کی سب سے نمایاں علامت یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ اور آل عمران دونوں کا آغاز حروفِ مقطعات ’’الٓمّٓ‘‘ سے ہوتا ہے۔‘‘ (۳۱)

آغاز و اختتام میں مشابہت:

’’سورۃ البقرۃ اور آل عمران میں مشابہت کے نمایاں پہلو یہ ہیں کہ دونوں حروف مقطعات ’’الٓمّٓ‘‘ سے شروع ہوتی ہیں۔ دونوں کے آغاز میں قرآن مجید کی عظمت کا بیان ہے‘ اگرچہ سورہ آل عمران میں اس کے ساتھ ہی تورات اور انجیل کا بیان بھی ہے۔ پھر یہ کہ دونوں کے اختتام پر بڑی عظیم آیات آئی ہیں۔ سورۃ البقرہ کے اختتام پر وارد آیات ہم پڑھ چکے ہیں۔ اس کی آخری آیت کو قرآن حکیم کی عظیم ترین دعاؤں میں سے شمار کیا جا سکتا ہے ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَاۤ اِنۡ نَّسِیۡنَاۤ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا ۚ ......﴾۔ سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں بھی ایک نہایت جامع دعا آئی ہے جو تین‘ چار آیتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔‘‘ (۳۲)

درمیانی مضامین میں مشابہت کے پہلو:

’’پھر جیسے میں نے آپ کو بتایا‘ سورۃ البقرہ بھی سورۃ الامتین ہے‘ دو اُمتوں سے خطاب اور گفتگو کر رہی

ہے‘اور یہی معاملہ سورۂ آل عمران کا بھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ سورۃ البقرہ میں زیادہ تر گفتگو یہود اور سورۂ آلِ عمران میں نصاریٰ کے بارے میں ہے۔ تو گویا اس طرح اہل کتاب سے گفتگو کی تکمیل ہو رہی ہے۔ اہلِ کتاب میں سے ’’یہود‘‘ اہم تر طبقہ تھا اور دینی اعتبار سے ان کی اہمیت زیادہ تھی‘ خواہ تعداد میں وہ کم تھے اور کم ہیں۔ دوسرا طبقہ عیسائیوں کا ہے‘ جن کا تذکرہ سورۃ البقرۃ میں بہت کم آیا ہے‘ لیکن سورۂ آل عمران میں زیادہ خطاب ان سے ہے۔‘‘(۳۳)

تقسیم و ترتیب میں مشابہت:

’’پھر جیسے سورۃ البقرۃ کے دو تقریباً مساوی حصے ہیں‘ پہلا نصف ۱۸ رکوع اور ۱۵۲ آیات پر مشتمل ہے اور نصف ثانی ۲۲ رکوع لیکن ۱۳۴ آیات پر مشتمل ہے‘ وہی کیفیت سورۂ آل عمران میں بتمام و کمال ملتی ہے۔ سورہ آل عمران کے بھی دو حصے ہیں‘ جو بہت مساوی ہیں۔ اس کے کل ۲۰ رکوع ہیں‘ ۱۰ نصف اوّل میں اور ۱۰ ہی نصف ثانی میں۔ پہلے دس رکوع میں ۱۰۱ آیات اور دوسرے دس رکوعوں میں ۹۹ آیات ہیں۔ یعنی صرف ایک آیت کا فرق ہے۔ پھر جیسے سورۃ البقرہ میں نصف اول کے تین حصے ہیں ویسے ہی یہاں بھی نصف اول کے تین حصے ہیں‘ لیکن یہاں تقسیم رکوعوں کے اعتبار سے نہیں بلکہ آیات کے اعتبار سے ہے۔‘‘(۳۴)

الفاظ اور جملوں کی مشابہت:

’’ان دونوں سورتوں کے مابین نسبت زوجیت کے حوالے سے آپ دیکھیں گے کہ بعض مقامات پر تو الفاظ بھی وہی آ رہے ہیں‘ وہی انداز ہے۔ جیسے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۳۶ میں فرمایا گیا: ﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ﴾ ’’(اے مسلمانو!) تم کہو ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور جو کچھ ہم پر نازل کیا گیا اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب پر نازل کیا گیا......‘‘ بالکل یہی مضمون سورۂ آل عمران کی آیت ۸۴ میں آیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر بھی دونوں سورتوں میں ملتا ہے۔ یہود کے بارے میں ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ......﴾ والی آیت سورۂ آل عمران میں بھی ہے‘ ذرا ترتیب کا فرق ہے۔‘‘ (۳۵)

سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ کی نسبتِ زوجیت

اس جوڑے کی نسبت کے حوالے سے محترم ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

☆افتتاح واختتام میں یکسانیت:

’’ان دو جوڑوں میں ایک نمایاں فرق یہ نظر آئے گا کہ سابقہ دو سورتوں میں پہلے حروفِ مقطعات ہیں اور پھر قرآنِ مجید اور کتبِ سماویہ کی عظمت کا بیان ہے‘ جبکہ ان دو سورتوں میں اس طرح کی کوئی تمہیدی گفتگو نہیں ہے بلکہ براہِ راست خطاب ہو رہا ہے۔ البتہ نسبتِ زوجیت کے اعتبار سے ان میں یہ فرق ہے کہ سورۃ النساء کے آغاز میں صیغۂ خطاب ’’یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ‘‘ (اے لوگو) ہے‘ یعنی خطاب عام ہے جبکہ سورۃ المائدۃ کا آغاز ’’یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا‘‘ کے صیغے سے ہوتا ہے‘ یعنی یہاں خطاب خاص طور پر انسانوں میں سے اُن لوگوں سے ہے جو ایمان کے دعوے دار ہیں۔ باقی جس طرح سورۃ البقرۃ اور سورۂ آلِ عمران نصفین میں منقسم ہیں اس طرح کا معاملہ ان دونوں سورتوں کا نہیں ہے۔‘‘(۳۶)

☆ **سورتوں کے اسالیب میں ہم آہنگی:**

سورۃ البقرۃ سے سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ کے اسلوب کا موازنہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اپنے اسلوب کے اعتبار سے یہ دونوں سورتیں سورۃ البقرۃ کے نصفِ ثانی کے مشابہ ہیں۔ یعنی چند مضامین کی لڑیاں چل رہی ہیں لیکن ایک رسّی کی طرح آپس میں اس طرح بٹی ہوئی اور گتھی ہوئی ہیں کہ وہ لڑیاں مسلسل نہیں بلکہ کٹواں نظر آتی ہیں...... سورۃ البقرۃ کے نصف ثانی کے مضامین کے بارے میں مَیں نے بتایا تھا کہ یہ گویا چار لڑیاں ہیں' جن میں دو کا تعلق شریعت سے ہے اور دو کا جہاد فی سبیل اللہ سے۔ شریعت کی دو لڑیوں میں سے ایک عبادات کی اور دوسری معاملات کی ہے' جبکہ جہاد فی سبیل اللہ کی لڑیوں میں سے ایک جہاد بالمال یعنی انفاق فی سبیل اللہ اور دوسری جہاد بالنفس کی آخری شکل یعنی قتال فی سبیل اللہ ہے۔ یہاں سورۃ النساء میں بھی آپ دیکھیں گے کہ تین لڑیاں اسی طرح آپس میں گتھی ہوئی ہیں اور ان کے رنگ کٹواں نظر آتے ہیں' لیکن اگر آپ ان سب کو علیحدہ علیحدہ کر لیں تو ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک الگ مضمون بن جائے گا۔''(۳۷)

آگے چل کے فرماتے ہیں کہ سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ میں نسبت زوجیت کیسے باعث تکمیل مضمون ہے۔

☆ **تکمیل مضامین کا دوسرا انداز:**

''سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ کے مابین ایک فرق نوٹ کر لیجیے۔ انسانی تمدن میں سب سے بنیادی چیز معاشرہ ہے' اور معاشرے میں بنیادی اہمیت عورت و مرد کے تعلق کو حاصل ہے۔ دوسرے یہ کہ معاشرے میں کچھ کمزور طبقات ہوتے ہیں' جن کے حقوق کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ یہ مضمون آپ کو سورۃ النساء میں ملے گا...... تو اس طریقے سے تمدن کی بنیادی منزل پر گفتگو ہو رہی ہے۔ سورۃ المائدہ میں تمدن کی بلند ترین منزل ریاست زیر بحث آئے گی اور اعلیٰ سطح پر عدالتی نظام کے لیے ہدایات دی جائیں گی کہ چوری' ڈاکا وغیرہ کا سدِباب کیسے کیا جائے گا۔ اس ضمن میں حدود و تعزیرات بھی بیان کی جائیں گی۔''(۳۸)

سورۃ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف کا جوڑا

''سورۃ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف دونوں مل کر ایک حسین وجمیل جوڑا بناتی ہیں۔ قرآن عظیم کے وسط میں یہ دو سورتیں حکمتِ قرآنی کے دو عظیم خزانے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان کئی حوالوں سے مشابہت پائی جاتی ہے اور کئی پہلوؤں سے ان کی آپس میں نسبتِ زوجیت بھی ظاہر ہوتی ہے...... اس سلسلے میں اہم نکات درج ذیل ہیں:

(۱) سورۂ بنی اسرائیل کا آغاز اللہ کی تسبیح (سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ ......) سے ہوتا ہے' جبکہ سورۃ الکہف بھی اللہ کی تحمید (اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ) سے شروع ہوتی ہے۔ ان دونوں کلمات کا تعلق اس حدیث سے واضح ہوتا ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا: ''التسبیح نصف المیزان والحمد للّٰہ یملؤہٗ'' ''تسبیح نصف میزان ہے اور الحمدللہ اسے بھر دیتا ہے''۔ یعنی سبحان اللہ کہنے سے معرفت خداوندی کی میزان آدھی ہو جاتی ہے اور الحمدللہ کہنے سے یہ میزان مکمل طور پر بھر جاتی ہے۔ گویا یہ دونوں کلمات مل کر کسی انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی معرفت کے اثاثے کی تکمیل کرتے ہیں۔

(۲) سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں مذکور ہے کہ ''اللہ اپنے بندے کو لے گیا'' جبکہ سورۃ الکہف کی پہلی آیت میں فرمایا کہ ''اللہ نے اپنے بندے پر کتاب اتاری''۔ گویا دونوں مقامات کی باہم متلازم (Reciprocal) نسبت ہے۔

(۳) سورۂ بنی اسرائیل کی ابتدائی آیات میں نبی اکرم ﷺ کے لیے ''رسول'' کے بجائے ''عبد'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

(۴) سورۂ بنی اسرائیل کی آخری دو آیات کا آغاز لفظ ''قُلْ'' سے ہوتا ہے اور اسی طرح سورۃ الکہف کی آخری دو آیات بھی لفظ ''قُلْ'' سے شروع ہوتی ہیں۔ نیز ان دونوں مقامات کی دو دو آیات کے مضامین میں باہم متلازم (Reciprocal) نسبت ہے۔

(۵) یہ دونوں سورتیں ریل کے ڈبوں کی طرح آپس میں جڑی ہوئی (inter-locked) ہیں۔ وہ اس طرح کہ سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت ایک حکم پر ختم ہو رہی ہے: ﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ ......﴾ ''اور کہیے کہ کل حمد اور تعریف اُس اللہ کے لیے ہے......'' جبکہ سورۃ الکہف کی پہلی آیت کے مضمون سے یوں لگتا ہے جیسے یہ اس حکم کی تعمیل میں نازل ہوئی ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ ......﴾ (۳۹)

(۶) دونوں سورتوں کے بارہ بارہ رکوع ہیں اور آیات کی تعداد بھی تقریباً برابر ہے۔

(۷) دونوں کے عین وسط میں حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ بیان ہوا ہے اور اس ضمن میں اس حد تک مشابہت ہے کہ نہ صرف دونوں سورتوں کے ساتویں رکوع کا آغاز اس واقعہ سے ہوتا ہے بلکہ دونوں جگہوں پر واقعہ کی ابتدا بھی ایک آیت سے ہو رہی ہے۔'' (۴۰)

سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعۃ کا جوڑا

سورۃ الصف اور سورۃ الجمعہ کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔

☆ آغاز میں ربط و تعلق:

''ان دونوں سورتوں کے آغاز میں تسبیح کے صیغے ان کی نسبت زوجیت کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ سورۃ الصّف کی پہلی آیت میں تسبیح کے ذکر کے لیے ماضی کا صیغہ ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ......﴾ آیا ہے' جبکہ سورۃ الجمعہ کے آغاز میں مضارع کا صیغہ ﴿یُسَبِّحُ لِلّٰهِ......﴾۔ فعل مضارع میں زمانہ حال اور زمانہ مستقبل دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس طرح ان سورتوں کے آغاز کی آیات میں تینوں زمانے (ماضی' حال اور مستقبل) اکٹھے ہونے سے تسبیح کے دائمی اور ابدی ہونے کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے' کہ کائنات کی ہر شے اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔ یہ تسبیح ہمیشہ سے ہو رہی ہے' ہر دم ہو رہی ہے اور ہمیشہ ہوتی رہے گی......'' (۴۱)

☆ مضامین میں ربط و تکمیلی شان:

''یہ دونوں سورتیں نبی ﷺ کی بعثت کے دو پہلوؤں سے بحث کرتی ہیں۔ ان کے مضامین کی تقسیم اس طرح ہے کہ سورۃ الصف میں انقلاب کے تکمیلی منہاج (مرحلہ تصادم)' جبکہ سورۃ الجمعہ میں اساسی منہاج (مرحلہ تیاری) کا ذکر ہے۔ سورۃ الصف کا مرکزی مضمون نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت ہے' جبکہ سورۃ الجمعہ کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ اس مقصدِ بعثت کے حصول اور اس عظیم مشن کی تکمیل کے لیے آپ ﷺ کا

بنیادی طریقہ کار کون سا تھا۔‘‘(۴۲)

نوٹ: سورتوں میں نسبت زوجیت کے لیے ضروری نہیں کہ سورتیں مصحف میں ایک ساتھ ہوں یا ایک ہی گروپ میں شامل ہوں، کیونکہ نسبت زوجیت کا دارومدار مضمون کی ہم آہنگی پر ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم ایک ایسی ہی مثال درج کرتے ہیں۔

سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب کی نسبتِ زوجیت

’’سورۃ النور مکی مدنی سورتوں کے تیسرے گروپ کی واحد مدنی سورت ہے جس کا جوڑا چوتھے گروپ کی واحد مدنی سورت، سورۃ الاحزاب ہے۔ دونوں سورتوں میں مندرجہ ذیل اعتبارات سے مطابقت پائی جاتی ہے:

(۱) زمانۂ نزول متصل ہے۔ سورۃ الاحزاب سن ۵ ھ میں غزوۂ احزاب کے بعد نازل ہوئی، جبکہ سورۃ النور سن ۶ ھ میں غزوۂ بنی مصطلق کے بعد نازل ہوئی۔

(۲) دونوں سورتوں میں رکوعوں کی تعداد ۹ ہے۔

(۳) دونوں سورتوں کا موضوع ایک ہے یعنی اسلام کے معاشرتی احکامات، خصوصاً ستر وحجاب کے احکامات۔ اس حوالے سے سورۃ النور میں گھر کے اندر کے پردے کا ذکر ہے جبکہ سورۃ الاحزاب میں گھر کے باہر کے پردے کا ذکر ہے۔

(۴) دونوں سورتوں میں منافقین کی طرف سے اٹھائے گئے جنسی بہتانوں کا ذکر ہے۔ سورۃ النور میں حضرت عائشہ ؓ کے خلاف اور سورۃ الاحزاب میں نبی اکرم ﷺ کے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے شادی کرنے کے خلاف۔

(۵) دونوں سورتوں میں منافقین کے کردار کو واضح کیا گیا ہے اور شدید مذمت کی گئی ہے، دوسری طرف مومنین کی مدح وستائش کی گئی ہے۔

(۶) دونوں سورتوں کا پانچواں رکوع چھ آیات پر مشتمل ہے اور انتہائی اہم ہے۔ اس میں موجود آیت ۳۵ (دونوں سورتوں میں) ایمان حقیقی کے موضوع پر انتہائی اہم آیت ہے۔‘‘(۴۳)

سورتوں کا داخلی نظم

محترم ڈاکٹر صاحبؒ اپنے منہجِ تفسیر میں نظمِ قرآن کے حوالے سے سورتوں کے داخلی نظم کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔ یعنی:

(۱) قرآن حکیم کی ہر سورت کا ایک خاص مرکزی مضمون ہوتا ہے جو اس سورت کا عمود کہلاتا ہے۔

(۲) سورت کی ہر آیت عمود سے تعلق رکھتی ہے۔

(۳) ہر آیت اپنی جگہ اللہ کے علم وحکمت کا ایک خزانہ ہے لیکن جب اسے ایک سلسلہ کلام کی لڑی میں پرو دیا جاتا ہے اور اس کا ربط مرکزی مضمون سے قائم کیا جاتا ہے تو حکمت ومعرفت کے نئے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔

ذیل میں کچھ مثالیں پیش خدمت ہیں:

سورۃ البقرۃ کا داخلی نظم

(۱) سورۃ البقرۃ پہلی مدنی سورت ہے۔

(۲) اس سورت کا جوڑا سورۃ آل عمران ہے اور ان دونوں سورتوں کو نبی اکرم ﷺ نے ''الزہراوین'' کا نام دیا ہے۔

(۳) سورۃ البقرۃ جس گروپ میں شامل ہے اس کا مرکزی مضمون ''احکامِ شریعت'' ہے۔

(۴) سورۃ البقرۃ ''سورۃ الامتین'' یعنی دو امتوں والی سورت کہلاتی ہے۔ اس کے نصف اول میں اصل روئے سخن اُمّت سابق یہود کی طرف ہے' جو اُس وقت اللہ کے نمائندے تھے اور زمین پر وہی اُمّتِ مُسلمہ کی حیثیت رکھتے تھے' لیکن انہوں نے اپنی بداعمالی کی وجہ سے اپنے آپ کو اس مقام کا نااہل ثابت کیا' لہٰذا وہ معزول کیے گئے اور ایک نئی اُمّت' اُمّتِ محمدیہ ﷺ اس مقام پر فائز کی گئی۔ چنانچہ نصف ثانی میں خطاب اُمّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ہے اور اس اُمت کی تاج پوشی کرنے کے ساتھ ساتھ اسے نئی شریعت عطا کی جا رہی ہے۔

(۵) اس کا ربط اپنے گروپ کے مرکزی مضمون سے یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ میں احکام شریعت کی ابتدا ہے (جسے ڈاکٹر صاحب جدید اصطلاح میں شریعتِ محمدیؐ کا بلیو پرنٹ بھی کہتے ہیں)۔ پھر سورۃ النساء میں اس میں مزید اضافہ ہوتا ہے اور سورۃ المائدۃ میں شریعت کے تکمیلی احکامات آتے ہیں' یعنی سورۃ المائدۃ تکمیل شریعت کی سورت ہے۔

(۶) مضامین کی تقسیم کچھ یوں ہے کہ نصف اول کے ۱۸ رکوع ہیں۔ ان کی تقسیم عمودی (vertical) ہے۔ ان ۱۸ رکوعوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے چار رکوع تمہیدی ہیں۔ پھر دس رکوع میں بنی اسرائیل سے خطاب ہے۔ پھر چار رکوع تحویلی (یعنی تحویلِ قبلہ سے متعلق) ہیں۔

نصف آخر کے ۲۲ رکوع ہیں۔ ان کی تقسیم افقی (horizontal) ہے۔ اس حصے میں چار مضامین تانے بانے کی طرح بُنے ہوئے ہیں: عبادات' احکامِ شریعت یعنی حلال وحرام (خاص طور پر عائلی قوانین)' انفاق فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ۔(۴۵)

ان مضامین کو ایک خوبصورت مثال کے ذریعے بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحبؒ لکھتے ہیں:

''اب ان چاروں مضامین یا چار لڑیوں کو ایک مثال سے سمجھیے۔ فرض کیجیے ایک سرخ لڑی ہے' ایک پیلی ہے' ایک نیلی ہے اور ایک سبز ہے' اور ان چاروں لڑیوں کو ایک رسّی کی صورت میں بٹ دیا گیا ہے۔ آپ اس رسّی کو دیکھیں گے تو چاروں رنگ کٹے پھٹے نظر آئیں گے۔ پہلے سرخ' پھر پیلا' پھر نیلا اور پھر سبز نظر آئے گا۔ لیکن اگر رسّی کے بل کھول دیں تو ہر لڑی مسلسل نظر آئے گی۔''(۴۶)

سورۃ الصّف کا داخلی نظم

(۱) سورۃ الصّف مدنی سورت ہے اور اپنے زمانہ نزول کے اعتبار سے یہ مدنی دور کے نصف آخر کی سورت ہے۔

(۲) سورۃ الصّف کا جوڑا سورۃ الجمعۃ ہے۔ سورۃ الصّف میں سیرت النبی ﷺ کا ایک رُخ بیان ہوا ہے‘ یعنی نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت: غلبۂ دین حق۔ سورۃ الجمعۃ میں سیرت النبی ﷺ کا دوسرا رخ بیان ہوا‘ یعنی غلبہ دین کے لیے نبی اکرم ﷺ کا اساسی طریقہ کار۔

(۳) یہ چھٹے گروپ کی دس مدنیات میں شامل ہے۔ ان دس مدنیات میں خطاب مسلمانوں سے ہے اور کفار کا ذکر ضمنی طور پر ہے‘ جبکہ اہلِ کتاب کا ذکر بطور عبرت ہے۔

(۴) چھٹے گروپ کا مرکزی مضمون ایمان بالآخرۃ ہے۔

(۵) سورۃ الصّف کا عمود آیت ۱۳ ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت بیان ہوا ہے۔ یوں یہ اس سورت کا مرکزی مضمون ہے۔

(۶) مضامین کے اعتبار سے سورۃ الصّف کی آیات کا تجزیہ اس طرح ہے:

آیات ۱ تا ۴: غلبۂ دینِ حق کے لیے جہاد کی دعوت‘ ترہیب کے انداز میں۔

آیات ۵ تا ۸: تاریخ بنی اسرائیل کے تین ادوار۔ غلبۂ دینِ حق کے لیے جہاد سے اعراض کا بیان بطور عبرت۔

آیت ۹: نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت‘ یعنی غلبۂ دینِ حق۔

آیات ۱۰ تا ۱۳: غلبۂ دینِ حق کے لیے جہاد کی دعوت‘ ترغیب کے انداز میں۔

آیت ۱۴: غلبۂ دینِ حق کی خاطر جہاد کرنے والوں کے لیے عظیم سعادت‘ اللہ کے مددگار ہونے کا اعزاز۔

(۷) اپنے گروپ کے مرکزی مضمون سے ربط یہ ہے کہ اس سورہ میں آخرت کی کامیابی کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے اور جہاد کرنے سے مشروط قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝۱۰﴾ [۴۷]

سورۃ التغابن کا داخلی نظم

(۱) سورۃ التغابن نظم قرآن کے لحاظ سے ایک شاہکار سورت ہے۔

(۲) اس کا جوڑا سورۃ المنافقون ہے۔

(۳) اس کا مرکزی مضمون ’’ایمان حقیقی اور اس کے ثمرات‘‘ ہے۔ آیات کے تجزیہ سے نظم قرآن کا اسلوب نمایاں ہوتا ہے۔

(۴) آیات کی تقسیم کچھ یوں ہے:

رکوع اول (۱۰ آیات) کی ذیلی تقسیم: ۷ آیات وضاحت ایمان‘ پھر ۳ آیات دعوت ایمان۔

رکوع دوم (۸ آیات) کی ذیلی تقسیم: ۵ آیات ایمان کے ثمرات و تقاضے‘ پھر تین آیات ایمان کے تقاضے ادا کرنے کی دعوت۔ [۴۸]

نتائج بحث

مندرجہ بالا توضیحات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے منہجِ تفسیر میں نظمِ قرآن کی اہمیت بنیادی نوعیت کی ہے۔ آپ نظمِ قرآن کے تحت ترتیب وتقسیم آیات وسور میں‘ سورتوں کے گروپس اور ان گروپوں کے مرکزی مضامین کا ذکر فرماتے ہیں۔ گروپ میں شامل سورتوں کا گروپ کے مرکزی مضمون سے ربط وتعلق واضح فرماتے ہیں۔ پھر سورتوں میں نسبت زوجیت کے مختلف پہلو اُجاگر فرماتے ہیں۔ آغاز واختتام میں یکسانیت‘ درمیانی مضامین میں مشابہت‘ اسلوبِ سور میں یکسانیت و مشابہت‘ ترتیب وتقسیم آیات میں باہمی مشابہت و مقاربت‘ اور الفاظ وجملوں کی مشاکلت ومشابہت واضح فرماتے ہیں۔

اس کے بعد سورت کا داخلی نظم آپ کے منہجِ تفسیر میں اہمیت کا حامل ہے۔ سورت کا مرکزی مضمون یا عمود ذکر کرنے کے بعد آیات کا عمود کے ساتھ ربط اور آیات کا باہمی ربط بیان فرماتے ہیں۔ پھر مضامین کے اعتبار سے آیات کی تقسیم وترتیب واضح فرماتے ہیں۔ نظمِ قرآن کے حوالے سے معرفت وحکمت کے نئے خزانوں کا ذکر فرماتے ہیں۔ گویا آپ کے دروسِ قرآن ہوں یا آپ کی تفسیر بیان القرآن دونوں میں نظمِ قرآن کا پہلو ایسا نمایاں اور واضح ہے کہ سورہ سے قبل‘ اس کے دوران اور اختتامِ سورہ پر جگہ جگہ یہی انداز نظر آتا ہے۔

حوالہ جات

(۱) کیرانوی‘ قاسمی‘ وحید الزماں‘ القاموس الجدید: ۸۹۷‘ ادارہ اسلامیات‘ ۱۴۱۰ھ

(۲) لوئیس معلوف‘ المنجد: ۹۰۴‘ مکتبہ قدوسیہ لاہور‘ ۲۰۰۲ء

(۳) لوئیس معلوف‘ المنجد: ۸۸۸‘ مکتبہ قدوسیہ لاہور‘ ۲۰۰۲ء

(۴) کیرانوی‘ قاسمی‘ وحید الزماں‘ القاموس الجدید: ۸۸۷‘ ادارہ اسلامیات‘ ۱۴۱۰ھ

(۵) السیوطی‘ عبدالرحمٰن بن ابی بکر‘ جلال الدین‘ الاتقان فی علوم القرآن ۲: ۳۷۱ الھیئۃ العصریۃ‘ ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء

(۶) القطان‘ مناع بن خلیل‘ مباحث فی علوم القرآن: ۹۶‘ مکتبہ المعارف للنشر والتوزیع‘ ۱۴۲۱ھ

(۷) ابو العلاء‘ عادل بن محمد‘ مصابیح الدرر فی تناسب آیات القرآن الکریم والسور: ۱۸ الجامعۃ الاسلامیۃ‘ المدینۃ المنورۃ: ۱۴۲۵ھ

(۸) مباحث فی علوم القرآن‘ ۹۶۔

(۹) الفراھی‘ حمید الدین ابو احمد عبد الحمید الانصاری‘ دلائل النظام: ۷‘ الدائرۃ الحمیدیہ‘ اعظم گڑھ‘ ۱۳۸۸ھ۔

(۱۰) مصابیح الدرر فی تناسب آیات القرآن الکریم والسور: ۱۸ (۱۱) مباحث فی علوم القرآن: ۹۶۔

(۱۲) الاتقان فی علوم القرآن: ۳۷۶ (۱۳) مجموعہ تفاسیر فراھی: ۴۷‘ ۴۶۔

(۱۴) اسرار احمد‘ ڈاکٹر بیان القرآن‘ ج ۱‘ ص ۱۲ انجمن خدام القرآن سرحد‘ پشاور‘ ۲۰۰۸ء

(۱۵) بیان القرآن‘ ج ۱ ص ۲۱۔ (۱۶) بیان القرآن‘ ج ۱‘ ص ۱۹۹۔

(۱۷) بیان القرآن‘ ج ۱‘ ص ۱۹۴‘ ۱۹۵۔ (۱۸) بیان القرآن‘ ج ۱‘ ص ۲۰۱‘ ۲۰۲۔

(۱۹) بیان القرآن‘ ج ۳‘ ص ۱۰۔ (۲۰) بیان القرآن‘ ج ۳‘ ص ۲۰۷۔

(باقی صفحہ 10 پر)

مِلاکُ التأوِیل (۴۳)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی

تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سُورۃُ النّحل

(۲۱۲) آیت ۳۴

﴿فَاَصَابَهُمۡ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوۡا وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۝۳۴﴾

''پس انہیں ان کے بُرے اعمال کے نتیجے مل گئے اور جس کی ہنسی وہ اُڑاتے تھے اس نے انہیں گھیر لیا۔''

اور سورۃ الزمر میں ارشاد فرمایا:

﴿فَاَصَابَهُمۡ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوۡا ؕ﴾ (آیت ۵۱)

''پس انہیں ان کی کمائی کے نتیجے مل گئے۔''

یہاں ''مَا عَمِلُوۡا'' اور ''مَا كَسَبُوۡا'' دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں' دونوں کا مطلب ایک جیسا ہے۔ اور اس کا سبب پہلے جو آیات آئی ہیں ان سے مناسبت ہوسکتی ہے۔ سورۃ النحل کی آیت میں مشرکین کے بارے میں کہا گیا: ﴿الَّذِيۡنَ تَتَوَفّٰٮهُمُ الۡمَلٰٓٮِٕكَةُ ظَالِمِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ ۖ فَاَلۡقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعۡمَلُ مِنۡ سُوۡٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ ۢ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۝۲۸﴾ ''وہ جن کی فرشتے اَرواح قبض کرتے ہیں وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں' تو پھر وہ جھک جاتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم تو کوئی بُرائی نہیں کرتے تھے۔ نہیں! اللہ بے شک جانتا ہے جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔''

اس کے بعد کلام کا رُخ کُفّارِ عرب کی طرف موڑ دیا کہ آیا وہ بھی اسی وقت کا انتظار کررہے ہیں کہ جب فرشتے ان کی رُوح قبض کرنے کے لیے آئیں گے' جیسے کہ پہلے والوں نے کیا تھا؟ فرمایا: ﴿هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ تَاۡتِيَهُمُ الۡمَلٰٓٮِٕكَةُ اَوۡ يَاۡتِىَ اَمۡرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ﴾ (آیت ۳۳) ''کیا وہ اس بات کا انتظار کررہے ہیں کہ فرشتے ان تک پہنچیں یا تیرے ربّ کا حکم نازل ہو جائے۔ پچھلے والوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔'' یعنی جیسے انہوں نے کہا تھا: ﴿مَا كُنَّا نَعۡمَلُ مِنۡ سُوۡٓءٍ ؕ﴾ ''ہم تو کوئی بُرائی نہیں کرتے تھے۔'' اور اسی سیاق میں پھر کہا گیا: ﴿فَاَصَابَهُمۡ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوۡا ؕ﴾ ''پس انہیں ان کے اعمال کی بُرائیوں نے آلیا۔'' تو اس طرح سورۃ النحل کی آیت میں ''مَا عَمِلُوۡا'' کا لایا جانا بالکل مناسب تھا۔

اب رہی سورۃ الزمر کی آیت تو اس سے قبل کی آیات ملاحظہ ہوں:

﴿وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴿۴۷﴾﴾

''اور اگر ظلم کرنے والوں کے پاس وہ سب کچھ ہو جو رُوئے زمین پر ہے اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہو تو بدترین سزا کے بدلے میں قیامت کے دن یہ سب کچھ دے دیں گے' اور ان کے سامنے اللہ کی طرف سے وہ ظاہر ہو گا جس کا انہیں گمان بھی نہ تھا۔''

﴿وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۸﴾﴾

''اور ان کے لیے جو کچھ انہوں نے کمایا تھا اس کی بُرائیاں ظاہر ہو گئیں اور انہیں گھیر لیا ان چیزوں نے جن کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔''

اور پھر ایک آیت کے بعد فرمایا: ﴿قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۵۰﴾﴾ ''اور ان سے اگلے بھی یہی بات کر چکے ہیں تو ان کے کچھ کام نہ آیا جو کچھ کمائی وہ کر رہے تھے۔'' اور اس کے بعد انہی آیات کی مناسبت سے ''مَا كَسَبُوْا'' کے الفاظ ہی اگلی آیت میں لائے گئے: ﴿فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۭ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۱﴾﴾ ''تو پھر جو کمائی انہوں نے کی تھی اس کی برائیوں نے انہیں آلیا' اور ان میں سے جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انہیں بھی ان کی کمائی کی برائیاں آلیں گی اور وہ ہمیں عاجز کرنے والے نہیں۔''

اور یوں ظاہر ہو گیا کہ سورۃ النحل کی آیات میں ''وَمَا عَمِلُوْا'' اور سورۃ الزمر میں ''وَمَا كَسَبُوْا'' کی تکرار سیاق وسباق کے اعتبار سے ہے۔ واللہ اعلم!

(۲۱۳) آیات ۵۳ تا ۵۵

﴿وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْــَٔــرُوْنَ ﴿۵۳﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾﴾

''تمہارے پاس جتنی بھی نعمتیں ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہیں' پھر جب تمہیں کوئی دُکھ پہنچتا ہے تو تم اسی کے سامنے گڑگڑاتے ہو۔ پھر جب وہ اس دُکھ کو تم سے دُور کر دیتا ہے تو تم میں سے ایک گروہ اپنے ربّ کے ساتھ شرک کرنا شروع کر دیتا ہے۔ تاکہ وہ اس کی ناشکری کرے جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے۔ تو پھر مزے اڑا لو' پس عنقریب تم جان لو گے۔''

اور سورۃ العنکبوت میں ارشاد فرمایا:

﴿فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ڔ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾﴾

''پھر جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو پکارتے ہیں اس کے لیے عبادت کو خالص کرتے ہوئے۔ تو جب وہ انہیں خشکی کی طرف لا کر نجات دے دیتا ہے تو پھر وہ شرک کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ تا کہ وہ ناشکری کریں ان تمام چیزوں کی جو ہم نے انہیں عطا کیں' اور تا کہ وہ مزے اڑا سکیں' تو پھر عنقریب وہ جان لیں گے۔''

اور سورۃ الروم کے الفاظ یہ ہیں:

﴿لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ۥ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۳۴﴾

''تا کہ وہ ناشکری کریں ان سب چیزوں کی جو ہم نے انہیں عطا کیں۔ تو پھر مزے اڑا لو' پس عنقریب تم جان لو گے۔''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۃ العنکبوت کی آیت میں لام کے ساتھ ''لِيَتَمَتَّعُوْا'' (تا کہ وہ مزے اُڑائیں) کہا گیا ہے اور باقی دونوں سورتوں میں فاء کے ساتھ ''فَتَمَتَّعُوْا'' (پس وہ مزے اُڑائیں) کہا گیا ہے تو کیا ان آیات میں ایسا کوئی فرق ہے کہ جس کی وجہ سے ان دونوں آیات میں لام نہیں لایا گیا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ سورۃ العنکبوت کی آیت کے آخر میں صیغہ عموم کے ساتھ کہا گیا: ﴿اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ۝۶۵﴾ ''تو وہ پھر شرک کرنے لگے۔'' جب کہ دونوں دوسری آیات میں صیغہ خاص کے ساتھ کہا گیا: ﴿اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ۝۵۴﴾ ''تو ان میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگا۔''

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ لام مذکور اس لیے لایا گیا ہے کہ اس سے ایک قسم کی دھمکی مقصود ہے۔ جیسے سورۃ ہود میں شعیب علیہ السلام کا قوم سے یہ خطاب نقل کیا گیا ہے: ﴿اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ﴾ (آیت ۹۳) ''تم اپنی جگہ عمل کرتے رہو' میں بھی عمل کرتا رہوں گا'' اور سورۃ الکہف میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (آیت ۲۹) ''اور جو چاہے سو کفر کرتا پھرے''۔ یعنی ان دونوں آیات کے طرزِ خطاب میں کُفّار کو دھمکی دی گئی ہے کہ تم مصیبت کے عالم میں ہمیں پکارتے ہو تو ہم تمہاری مدد کرتے ہیں اور تمہاری مصیبت سے تمہیں نکال دیتے ہیں' لیکن دوبارہ پھر تم شرک کرنے لگتے ہو تو پھر جاؤ اور دنیا کے مزے اڑاؤ۔ تم خود ہی اپنا انجام دیکھ لو گے!

اب آیئے دوسرے سوال کی طرف' سورۃ النحل کی آیت میں خطاب تو عام ہے' کہا جا رہا ہے: ''اور تم پر جو بھی نعمتیں ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہیں' پھر جب تمہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو تم اسی کی طرف پناہ طلب کرتے ہو اور جب وہ تم سے یہ مصیبت ہٹا دیتا ہے تو تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ شرک کرنا شروع کر دیتا ہے۔''

سورۃ الروم کی آیت میں بھی اس سے ملتا جلتا مضمون ہے:

﴿وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ۝۳۳﴾

''اور جب لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں' اسی کی طرف جھکتے ہوئے' پھر جب وہ انہیں اپنی طرف سے رحمت سے نوازتا ہے تو ان میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ شرک کرنا شروع کر دیتا ہے۔''

ملاحظہ ہو کہ خطاب عام ہے‘ اور چونکہ اس کے مخاطب بہت سے لوگ ہیں اس لیے اس خطاب کے سننے والے ہر طرح کا ردِّعمل ظاہر کر سکتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ اپنی حالتِ زار کے بارے میں متفکّر ہوں گے تو کچھ لوگ اس کی مخالفت کریں گے‘ اس لیے سورۃ النحل اور سورۃ الروم دونوں میں اس بات کی صراحت کر دی گئی کہ ان میں سے کچھ لوگ پھر بھی باز نہیں آئیں گے بلکہ شرک میں مبتلا رہیں گے‘ یعنی کچھ دوسرے لوگ ایسے بھی ہوں گے جو شرک نہیں کریں گے۔ پھر بعد میں جو دھمکی آمیز کلمات کہے گئے‘ ان کے مخاطب پہلے گروہ کے لوگ ہی ہوں گے‘ تاہم چونکہ خطاب عام ہے تو گویا یہ ڈراوا ہے جو سب کو دیا جا رہا ہے لیکن ہے انہی کے لیے جو اپنے شرک پر ڈٹے رہے۔

سورۃ العنکبوت میں ایک خاص تمثیل ذکر کی جا رہی ہے اور وہ ان چند لوگوں کی ہے جو کشتی میں سوار ہیں‘ بھنور میں پھنس جاتے ہیں تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی التجاؤں کو سن لیتا ہے اور انہیں مصیبت سے نجات دے دیتا ہے‘ لیکن وہ دوبارہ شرک کی طرف عود کر آتے ہیں۔ یہاں ایک چھوٹا سا گروہ ہے جس کی تمثیل بیان کی جا رہی ہے اس لیے یہاں سب کے سب مراد ہیں‘ یعنی جو دھمکی آخر میں دی گئی ہے وہ سب کے لیے ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ آیت باقی دونوں سورتوں سے ایک مختلف انداز رکھتی ہے اور اسی لیے اندازِ بیان میں بھی اختلاف واقع ہوا۔ واللہ اعلم!

(۲۱۴) آیت ۶۰

﴿وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶۰﴾

’’اور اللہ ہی کے لیے برتر مثال ہے۔ اور وہ غلبہ رکھتا ہے‘ حکمت والا ہے۔‘‘

اور سورۃ الروم میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۲۷﴾

’’اور آسمانوں اور زمین میں اُسی کے لیے برتر مثال ہے۔ اور وہ غلبہ والا‘ حکمت والا ہے۔‘‘

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۃ الروم کی آیت میں بمقابلہ سورۃ النحل ’’فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ‘‘ کا اضافہ ہے‘ حالانکہ یہ بات سورۃ النحل کی آیت سے بھی سمجھی جا سکتی ہے‘ کیونکہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ سورۃ النحل کی آیت سے قبل یہ الفاظ تھے: ﴿لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ﴾ ’’جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے لیے ایک بُری مثال ہے۔‘‘ اس کے مقابلے میں کہا گیا: ﴿وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ ’’اور اللہ کے لیے تو برتر مثال ہے‘‘۔ اور چونکہ اس سے قبل آسمانوں اور زمین کا ذکر نہیں تھا اس لیے ان کا ذکر کرنا مناسب نہ تھا۔

سورۃ الروم کی مذکورہ آیت سے قبل فرمایا:

﴿وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهُ قٰنِتُوْنَ ۝۲۶﴾

’’اور اُس کے لیے ہے جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے‘ ہر ایک اُس کا اطاعت گزار ہے۔‘‘

پھراس کے بعد ارشاد ہوا:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ؕ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾

''وہی اللہ ہے جو خلق کو شروع کرتا ہے اور پھر اسے دوبارہ لوٹاتا ہے اور یہ کام اس کے لیے بہت آسان ہے۔ اور اسی کے لیے آسمانوں اور زمین میں برتر مثال ہے۔''

اور یوں واضح ہو گیا کہ دونوں آیات میں اپنی اپنی جگہ پوری مناسبت پائی جاتی ہے۔

(۲۱۵) آیت ۶۱

﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ﴾

''اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم کی بنا پر گرفت کرتا تو روئے زمین پر کسی جاندار کو بھی نہ چھوڑتا' لیکن وہ انہیں ایک مقررہ وقت تک ڈھیل دیتا ہے۔''

اور سورۃ الملائکہ (فاطر) میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ﴾ (آیت ۴۵)

''اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے کیے کرائے اعمال پر گرفت کرتا رہتا تو روئے زمین پر کوئی ایک جانور کو بھی نہ چھوڑتا' لیکن وہ انہیں ایک مقررہ وقت تک ڈھیل دیتا ہے۔''

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں: پہلی آیت میں ''بِظُلْمِهِمْ'' (ان کے ظلم کی بنا پر) اور دوسری آیت میں ''بِمَا كَسَبُوْا'' (جو کچھ انہوں نے کمائی کی) کے الفاظ ہیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ پہلی آیت میں ''عَلَيْهَا'' (اُس یعنی زمین پر) اور دوسری آیت میں ''عَلٰى ظَهْرِهَا'' (اس کی پیٹھ پر) کہا گیا تو اس کی کیا وجہ ہے؟

جواباً عرض ہے کہ سورۃ النحل کی آیت سے پہلے ارشاد ہوا:

﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝۵۸ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ؕ﴾

''اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ جی ہی جی میں گھٹتا رہتا ہے۔ لوگوں سے چھپا پھرتا ہے کہ کیسی بری خوشخبری اسے بتائی گئی ہے۔ (اور سوچتا ہے کہ) کیا اسے ذلت کے ساتھ رہنے دوں یا اسے مٹی میں دبا دوں!''

یہ اشارہ ہے عرب جاہلیت کی اس بُری روایت کی طرف کہ وہ بچی کی ولادت پر ہرگز خوش نہ ہوتے تھے بلکہ اسے زندہ دفن کرنے کے درپے ہو جاتے تھے' حالانکہ اس بچی کا نہ کوئی جرم تھا اور نہ کوئی ادنیٰ شبہ بھی کہ جو اس کے قتل کے لیے جواز کا باعث بنتا۔ اور اس مناسبت سے یہاں ظلم کا لفظ لایا گیا۔

’’عَلَیۡھَا‘‘ میں ضمیر زمین کی نسبت سے لائی گئی ہے جو سیاقِ کلام سے سمجھی جاسکتی ہے اور ان کا جرم اتنا بڑا تھا کہ اس کے لیے ظلم کا صراحت کے ساتھ ذکر کرنا ضروری تھا۔ جہاں تک سورۃ الملائکہ (یا سورۃ فاطر) کا تعلق ہے تو مذکورہ آیت سے ماقبل ایسے کسی جرم کا بیان نہیں ہوا‘ بلکہ یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰہِ جَہۡدَ اَیۡمَانِہِمۡ لَئِنۡ جَآءَہُمۡ نَذِیۡرٌ لَّیَکُوۡنُنَّ اَہۡدٰی مِنۡ اِحۡدَی الۡاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَہُمۡ نَذِیۡرٌ مَّا زَادَہُمۡ اِلَّا نُفُوۡرَا ﴿۴۲﴾﴾

’’اور ان کافروں نے بڑی زوردار قسم کھائی تھی کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آیا تو وہ کسی بھی اُمت سے زیادہ ہدایت پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ لیکن جب ان کے پاس ایک ڈرانے والا آ گیا تو ان کی نفرت میں ہی اضافہ ہوا۔‘‘

﴿اسۡتِکۡبَارًا فِی الۡاَرۡضِ وَمَکۡرَ السَّیِّیءِ ؕ وَلَا یَحِیۡقُ الۡمَکۡرُ السَّیِّیءُ اِلَّا بِاَہۡلِہٖ ؕ فَہَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا سُنَّتَ الۡاَوَّلِیۡنَ ۚ﴾ (آیت ۴۳)

’’زمین میں تکبر کرتے ہوئے اور برائی کا داؤ لگاتے ہوئے۔ اور بُرا داؤ اس کے کرنے والے ہی کی طرف پلٹ کر آتا ہے۔ تو کیا پھر وہ اگلے لوگوں کے ساتھ جو کچھ ہوا‘ اسی کے انتظار میں ہیں۔‘‘

اب یہاں ان کی چند بُری صفات اور بُرے اعمال کی طرف اشارہ ہے‘ اس لیے ’’بِمَا کَسَبُوۡا‘‘ کہہ کر ان کے کرتوتوں کی طرف توجہ دلائی گئی اور پھر ’’مَا تَرَكَ عَلٰی ظَھۡرِھَا‘‘ (اور نہیں چھوڑا کسی بھی جاندار کو اس کی پیٹھ پر) کے الفاظ زمین کے لیے لائے گئے۔ دونوں جگہ مضمون ایک ہی ہے‘ لیکن سورۃ النحل میں فردِ جرم کے لیے صرف ایک لفظ (ظلم) لایا گیا کہ وہاں ایک خاص ظالمانہ گناہ کا تذکرہ تھا۔ اور اس مناسبت سے صرف ’’عَلَیۡھَا‘‘ کا مختصر لفظ لایا گیا‘ جب کہ سورۃ فاطر میں مضمون بھی طویل تھا‘ اس لیے فردِ جرم کے لیے بھی دو لفظ ’’بِمَا کَسَبُوۡا‘‘ لائے گئے اور زمین کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بھی ’’عَلٰی ظَھۡرِھَا‘‘ کہہ کر الفاظ میں اضافہ کیا گیا۔ یہ بات ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ دو مماثل آیات میں جہاں اندازِ بیان مختصر ہو وہاں سیاقِ کلام میں الفاظ بھی کم لائے جاتے ہیں اور جہاں بیان میں پھیلاؤ ہو تو وہاں الفاظ کی بھی فراوانی ہوتی ہے۔

(۲۱۶) آیات ۶۵ تا ۶۹

﴿وَاللّٰہُ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ ﴿۶۵﴾﴾

’’اور اللہ نے آسمان سے پانی اتارا اور اس سے زمین کو زندہ کیا اس کی موت کے بعد۔ بے شک اس میں ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سنتے ہیں۔‘‘

﴿وَاِنَّ لَکُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَۃً ؕ نُسۡقِیۡکُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِہٖ مِنۡۢ بَیۡنِ فَرۡثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیۡنَ ﴿۶۶﴾﴾

’’اور بے شک تمہارے لیے چوپایوں میں بڑے غور وفکر کا مقام ہے۔ ہم تمہیں پلاتے ہیں جو کچھ ان کے

پیٹوں میں ہے‘ اس سے خون اور گوبر کے درمیان میں سے وہ دودھ جو خالص اور پینے والوں کے لیے خوشگوار ہوتا ہے۔‘‘

﴿وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۶۷﴾

’’اور کھجور اور انگور کے پھلوں میں سے تم نشہ بھی بناتے ہو اور اچھی کمائی بھی۔ بے شک اس میں ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں۔‘‘

﴿وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۝۶۸﴾

’’اور آپ کے ربّ نے شہد کی مکھی کو یہ سمجھا دیا کہ وہ پہاڑوں میں اپنے گھر بنائے‘ اور درختوں میں بھی اور ان چھپروں میں بھی جو لوگ بناتے ہیں۔‘‘

﴿ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۶۹﴾

’’پھر (کہا کہ) تمام پھلوں میں سے کھا اور پھر اپنے رب کی آسان راہوں میں چلتی پھرتی رہ۔ ان کے پیٹوں میں سے ایسا مشروب نکلتا ہے جس کے طرح طرح کے رنگ ہوتے ہیں اور اس میں لوگوں کے لیے شفا ہوتی ہے۔ بے شک اس میں بھی ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں۔‘‘

ان پانچ آیات میں تین سوال ابھرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو مضمون کے اعتبار سے یہ تین مجموعہ آیات ہیں:

آیت ۶۵ جس کے آخر میں ﴿لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ﴾ لایا گیا۔

آیت ۶۶ اور ۶۷ جس کے آخر میں ﴿لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ لایا گیا۔

آیت ۶۸ اور ۶۹ جس کے آخر میں ﴿لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ لایا گیا۔

پہلا سوال: تینوں مجموعہ آیات کے آخر میں ’’اٰيَةً‘‘ صیغہ مفرد کے ساتھ لایا گیا ہے حالانکہ دوسرے مجموعہ آیات میں ایک سے زائد نعمتیں بیان ہوئی ہیں‘ یعنی مادہ جانوروں کے دودھ کا ذکر ہے اور پھر پھلوں میں سے نشہ آور مشروب بنانے اور اچھا رزق حاصل کرنے کا ذکر ہے۔

دوسرا سوال: تینوں آیات کے اختتامی کلمات (يَسْمَعُوْنَ‘ يَعْقِلُوْنَ‘ يَتَفَكَّرُوْنَ) مختلف ہیں۔

تیسرا سوال: ﴿نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ﴾ یہاں لفظ ’’بُطُوْنِهٖ‘‘ میں ضمیر مذکر ہے جو لفظ ’’الْاَنْعَامِ‘‘ کی طرف لوٹتی ہے جو کہ جمع ہے۔ اور اس کے بالمقابل سورۃ المؤمنون میں کہا گیا:

﴿وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا﴾ (آیت ۲۱)

’’اور تمہارے لیے چوپایوں میں سامانِ غور وفکر ہے۔ ہم تمہیں پلاتے ہیں جو ان کے پیٹوں میں ہے۔‘‘

یہاں ’’بُطُوْنِهَا‘‘ میں ضمیر مؤنث لائی گئی ہے جو لفظ ’’الْاَنْعَامِ‘‘ کی طرف لوٹتی ہے‘ تو یہ فرق کیوں ہے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ دوسرے مجموعہ آیات میں گو دو نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے‘ لیکن آخر میں ﴿لَاٰيَةً

لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴾ کہہ کر اشارہ دوسری نعمت کی طرف ہے اور وہ ہے کھجور اور انگور سے نشہ آور مشروب کشید کرنا اور اسے بطور رزق استعمال کرنا۔ اور جہاں تک پہلی نعمت کا تعلق ہے یعنی چوپایوں کے پیٹوں میں سے گوبر اور خون کے درمیان میں سے خالص اور خوشگوار مشروب دودھ کی شکل میں نکالا' تو اس کی طرف تو آیت کے آغاز ہی میں ان الفاظ کے ساتھ اشارہ کر دیا گیا تھا: ﴿ وَ اِنَّ لَکُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَۃً ؕ﴾ ''تمہارے لیے چوپایوں میں سامانِ عبرت (یعنی مقامِ غور و فکر) ہے'' تو اس لیے لفظ ''اٰیَۃً'' کی جگہ ''اٰیت'' لانے کی چنداں ضرورت نہ تھی' اور یوں تینوں مجموعہ آیات میں ایک ایک نعمت کو بطور نشانی بیان کیا گیا۔ پہلی آیت میں آسمان سے پانی اتارے جانے کی طرف اشارہ ہے اور تیسری آیت میں شہد کی مکھی کی طرف اس قدرت کے ودیعت کیے جانے کا تذکرہ ہوا کہ جس کے بموجب وہ پھلوں کا رس چوس چوس کر شہد کے چھتے بناتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر تین آیات میں ایک ایک نعمت کا ذکر ہوا ہے اور اگر کچھ تفصیلی بیان بھی ہوا ہے تو وہ اس نعمت کا حال یا اس کے وصف کے طور پر ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت کے اختتام پر کہا گیا:

﴿ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ ﴿٦٥﴾ ﴾

''اس میں نشانی ہے ایسے لوگوں کے لیے جو سنتے ہیں۔''

اس آیت سے قبل ارشاد ہوا تھا:

﴿ وَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَہُمُ الَّذِی اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ ﴾

''اور (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ پر کتاب نہیں اتاری مگر اس لیے کہ آپ انہیں کھول کھول کر بتائیں وہ تمام باتیں جن میں انہوں نے اختلاف کیا۔''

اور پھر کہا:

﴿ وَ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃً لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿٦٤﴾ ﴾

''اور اسے ہدایت اور رحمت بنایا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔''

کتاب کا اتارنا' پانی کے اتارنے کے ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا۔ کتاب کو بندوں کے لیے رحمت قرار دیا اور ایسے ہی پانی کو بھی رحمت کہا گیا۔ اور پھر اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ جیسے آسمان سے اترنے والا پانی تمہارے لیے باعثِ رحمت ہے ایسے ہی کتاب کے ضمن میں جو کچھ اتارا گیا وہ بھی تمہارے لیے رحمت کا موجب ہے' اور ان دونوں چیزوں کے درمیان جو مماثلت ہے' اُسے سمجھنے کے لیے زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے کہ جس طرح مردہ زمین پانی کی بوچھاڑ سے لہلہا اٹھتی ہے' اسی طرح وحی سماوی سے مُردہ دل جاگ اٹھتے ہیں۔

نازل شدہ کتاب سے کیسے فائدہ اٹھایا جاتا ہے؟ صرف اس کے سننے سے! اور اسی لیے کفّار لوگوں کو قرآن کے سننے سے منع کیا کرتے تھے: ﴿ وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَا تَسۡمَعُوۡا لِہٰذَا الۡقُرۡاٰنِ ﴾ (حٰمٓ السجدۃ: ٢٦) ''اور کافروں نے کہا اس قرآن کو نہ سنو!'' اور پھر جنّوں کا یہ قول نقل کیا گیا جو قرآن سن کر ہدایت پا گئے تھے: ﴿ اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا ۙ﴿١﴾ ﴾ (الجن) ''ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے۔'' اور اس قرآن کی سماعت سے وہی متاثر

ہوتا ہے جو اس سے بھاگ نہ رہا ہو بلکہ کان لگا کر سن رہا ہو۔ اور ایسا ہی شخص جب آسمان سے پانی اتارے جانے کے بارے میں سنے گا تو اس سے بھی عبرت و نصیحت حاصل کرے گا۔ اس لحاظ سے آیت کے آخر میں ''لِقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ'' کا کہنا بالکل مناسب تھا کہ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانی ہے جو سنتے ہیں۔ واللہ اعلم!

جہاں تک دوسری آیت کا تعلق ہے تو اس میں کھجور اور انگور سے شراب کشید کرنے اور رزقِ حسن حاصل کرنے کا بیان ہے۔ کیا حواس سے یا صرف غور وفکر سے اس کا ادراک کیا جا سکتا ہے؟ چنانچہ یہاں آخر میں ''لِقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ'' کہا گیا کہ ایسی بات جس کی علت (سبب) معلوم نہ ہو بشرطیکہ وہ ناممکنات میں سے نہ ہو' ایسی بات کہ بشر اس کے فہم سے عاجز ہوں' صرف اللہ تعالیٰ ہی اسے جانتا ہو' تو پھر عقل کے ذریعہ ہی اس کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔

رہی تیسری آیت کہ جس میں شہد کی مکھی اور اس کے کارناموں کا ذکر ہے تو وہ قابلِ مشاہدہ چیز ہے اور اس میں غور وفکر کرنے کا بہت بڑا موقع ہے اور اس نسبت سے آیت کے آخر میں ''لِقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ'' کا ذکر کیا گیا۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ لفظ ''بُطُوۡنِہٖ'' میں ضمیر مذکر ''الانعام'' (چوپایوں) کی طرف لوٹتی ہے۔ بقول سیبویہ لفظ ''الانعام'' اہلِ عرب کے ہاں مذکر بھی بولا جاتا ہے یعنی ''ھو الانعام'' کی ترکیب بھی موجود ہے۔ یہاں اشارہ جنس انعام کی طرف ہے۔ اس کے بالمقابل سورۃ المؤمنون میں عام عربی قاعدے کے مطابق جمع مکسر کو مؤنث مانا جاتا ہے اس لیے الانعام جو کہ جمع مکسر ہے اس کے لیے ''بُطُوۡنِہَا'' میں ضمیر مؤنث لائی گئی ہے اور ملاحظہ ہو کہ اس ایک آیت میں چار دفعہ اسی مضمون کو بیان کرنے کے لیے ضمیر مؤنث کا اعادہ کیا گیا ہے۔ ایک دفعہ پھر آیت کی قراءت کرلیں:

﴿نُسۡقِیۡکُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِہَا وَلَکُمۡ فِیۡہَا مَنَافِعُ کَثِیۡرَۃٌ وَّمِنۡہَا تَاۡکُلُوۡنَ ﴿۲۱﴾ وَعَلَیۡہَا وَعَلَی الۡفُلۡکِ تُحۡمَلُوۡنَ ﴿۲۲﴾﴾

اضافہ از مترجم: ہر جمع (یعنی جمع مکسر) مؤنث شمار ہوتی ہے' اس کے بارے میں یہ شعر یاد رکھیں۔ شاعر اپنا ماجرا بیان کر رہا ہے کہ ایک موقع ایسا آیا کہ ساری قوم اس کے قتل کے درپے تھی' تو وہ کہتا ہے:

اِنَّ قَوۡمِیۡ تَجَمَّعُوۡا وَبقتلی تَحَدَّثُوا

''میری قوم جمع ہوگئی ہے اور مجھے قتل کرنے کے بارے میں بات ہو رہی ہے۔''

لَا اُبَالِیۡ بِجمعِھِم کُلُّ جَمۡعٍ مُؤنَّثٌ

''مَیں ان کے جمع ہونے کی پرواہ نہیں کرتا' اس لیے کہ ہر جمع مؤنث ہوتی ہے۔''

(۲۱۷) آیت ۷۰

﴿وَاللّٰہُ خَلَقَکُمۡ ثُمَّ یَتَوَفّٰىکُمۡ ۟ۙ وَمِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّرَدُّ اِلٰۤی اَرۡذَلِ الۡعُمُرِ لِکَیۡ لَا یَعۡلَمَ بَعۡدَ عِلۡمٍ شَیۡـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ قَدِیۡرٌ ﴿۷۰﴾﴾

''اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہیں وہ وفات دیتا ہے' اور تم میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو پھر بدترین عمر کی

طرف لوٹائے جاتے ہیں تا کہ جاننے بوجھنے کے بعد ایسے ہو جائیں کہ جیسے کچھ نہ جانتے تھے۔ بے شک اللہ جاننے والا' قدرت والا ہے۔''

اور سورۃ الحج میں ارشاد فرمایا:

﴿ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ؕ﴾ (آیت ۵)

''پھر تم اپنی جوانی کو پہنچو' اور تم میں سے وہ ہیں جو اٹھا لیے جاتے ہیں اور تم میں سے وہ ہیں جو بدترین عمر کو لوٹا دیے جاتے ہیں تا کہ وہ جاننے بوجھنے کے بعد ایسے ہو جائیں جیسے کہ وہ کچھ نہ جانتے تھے۔''

سوال یہ بنتا ہے کہ دونوں آیات کا مضمون ایک جیسا ہے لیکن سورۃ الحج کی آیت میں ''لِكَيْ لَا يَعْلَمَ'' کے بعد ''مِنْ'' کا اضافہ ہے' کہا گیا ''مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا''۔ لیکن سورۃ النحل کی آیت میں ''مِنْ'' ساقط ہے' کہا گیا: ''بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا'' تو اس کا کیا سبب ہے؟

اس کا جواب سورۃ الحج کی آیت کا مطالعہ کرنے سے واضح ہو جائے گا کہ جس میں ''مِنْ'' کی تکرار ہے اور اس لحاظ سے سیاق وسباق کا' الفاظ کی مناسبت کا' نظم آیات میں مشابہت کا اور حروف ومعانی کی رعایت کا تقاضا تھا کہ ایسا کیا جاتا۔

اب آیئے اس آیت پر ایک نظر ڈال لیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ﴾

''اے لوگو! اگر تم (قیامت کے دن) دوبارہ اٹھائے جانے کے بارے میں شک کرتے ہو تو (سنو) کہ ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔''

﴿ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ﴾

''پھر منی کے قطرے سے' پھر جونک نما جمے خون سے' پھر گوشت کے لوتھڑے سے کہ کچھ کی صورت گری ہو جاتی ہے اور کچھ کی نہیں ہوتی تا کہ ہم تمہارے لیے (اپنی قدرت کو) ظاہر کر سکیں۔''

﴿وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ﴾

''اور ہم بچہ دانی میں اسے ٹھہرا دیتے ہیں جب تک چاہیں ایک معلوم مدت تک' پھر ہم تمہیں بچے کی شکل میں نکالتے ہیں' پھر یہ کہ تم اپنی جوانی کی عمر کو پہنچو۔''

﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ؕ﴾

''اور تم میں سے کچھ اٹھا لیے جاتے ہیں اور تم میں سے کچھ نکمی عمر کی طرف لوٹا دیے جاتے ہیں تا کہ وہ (بہت کچھ) جاننے کے بعد ایسے ہو جائیں جیسے کچھ بھی نہ جانتے تھے۔''

﴿وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۵﴾

''اور تو زمین کو خشک و بیابان دیکھتا ہے' پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ جاگ اٹھتی ہے اور اُبھرنا

شروع ہو جاتی ہے اور پھر ہر طرح کے خوشنما جوڑے اگاتی ہے۔''

ملاحظہ ہو کہ ﴿لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ ۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ﴾ سے قبل سات دفعہ ''مِنْ'' کا حرف آیا ہے اور اس کے بعد بھی ایک دفعہ ذکر کیا گیا ہے۔ اور ہر جگہ ''مِنْ'' اپنا معنی رکھتا ہے سوائے اس جگہ کے‘ اگر نہ بھی لایا جاتا تو معنی میں کوئی فرق نہ پڑتا‘ لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا‘ نظمِ کلام اس بات کا مقتضی ہوا کہ اسے لایا جائے۔

جہاں تک سورۃ النحل کی آیت کا تعلق ہے تو وہاں نظمِ کلام میں ایسی کوئی وجہ نہ تھی کہ حرف ''مِنْ'' کو لایا جاتا‘ اس لیے وہاں اصل پر باقی رہنے دیا گیا۔

ایک بات اور عرض کرتے چلیں کہ آیت کے آغاز میں ''مِنَ الْبَعْثِ'' کہا گیا۔ یہاں ''مِنْ'' ابتداء غایت کے لیے ہے (یعنی جہاں جانا ہے اس کی ابتداء کہاں سے ہے) اور اس کے بعد سوائے ''مِنْ ۢ بَعْدِ عِلْمٍ'' کے‘ جتنے بھی حروف ''مِنْ'' آئے ہیں وہ تبعیض (یعنی کچھ) کا معنی رکھتے ہیں۔ اور ''مِنْ ۢ بَعْدِ عِلْمٍ'' میں وارد ''مِنْ'' زائد شمار ہوگا لیکن اسے لَا نافیہ کی مناسبت سے لایا گیا جو اس سے قبل ذکر کیا گیا ہے۔

(۲۱۸) آیت ۷۲

﴿اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿٧٢﴾﴾

''تو کیا باطل پر وہ ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمت سے وہ انکار کرتے ہیں۔''

اور سورۃ العنکبوت میں ارشاد فرمایا:

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴿٦٧﴾﴾

''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے ایک امن سے بھرپور حرم بنا دیا ہے اور ان کے اردگرد لوگوں کو اُچک لیا جاتا ہے۔ تو پھر وہ باطل پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں۔''

ایک سائل سوال کر سکتا ہے کہ پہلی آیت میں ضمیر منفصل ''هُمْ يَكْفُرُوْنَ'' کے ساتھ اس آیت کا اتمام ہوتا ہے اور سورۃ العنکبوت کی آیت میں وہی مضمون ہے لیکن وہاں ''يَكْفُرُوْنَ'' سے پہلے ضمیر منفصل کیوں ساقط کی گئی؟

اس کا جواب یہ ہے‘ واللہ اعلم‘ کہ اس آیت سے قبل ایک نعمت کا تذکرہ ہے جس میں اولاد اور بیٹوں‘ پوتوں کے دیے جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ﴾ (آیت ۷۲)

''اور اللہ نے تمہاری ہی جنس سے تمہارے لیے جوڑے بنائے اور تمہارے لیے تمہاری بیویوں سے بیٹے اور پوتے عطا کیے اور تمہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق بہم پہنچایا۔''

ان آیات کے فوراً بعد پھر کہا گیا:

﴿ اَفَبِالۡبَاطِلِ یُؤۡمِنُوۡنَ وَبِنِعۡمَتِ اللّٰہِ ہُمۡ یَکۡفُرُوۡنَ ﴿۷۲﴾ ﴾

''پھر کیا وہ باطل پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمت سے وہ انکار کرتے ہیں!''

اب خدشہ اس بات کا تھا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ''یُؤۡمِنُوۡنَ'' اور ''یَکۡفُرُوۡنَ'' سے مراد یہی لوگ ہیں جن کا تذکرہ ان اختتامی آیات میں کیا گیا ہے' بلکہ یہاں تذکرہ ان لوگوں کا ہے جن کا ان آیات سے بہت پہلے آیت ۵۶ سے آیت ۶۲ تک کیا گیا تھا۔ ہم یہاں ان مجموعہ آیات کے آغاز اور اختتام کا ذکر کیے دیتے ہیں تاکہ مضمونِ آیات واضح ہو جائے۔ فرمایا:

﴿ وَیَجۡعَلُوۡنَ لِمَا لَا یَعۡلَمُوۡنَ نَصِیۡبًا مِّمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ ؕ تَاللّٰہِ لَتُسۡـَٔلُنَّ عَمَّا کُنۡتُمۡ تَفۡتَرُوۡنَ ﴿۵۶﴾ ﴾

''اور یہ لوگ اس رزق میں سے جو ہم نے انہیں دیا ہے ان (بتوں) کے لیے جن کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے' ایک حصہ مقرر کر دیتے ہیں۔ اللہ کی قسم! تم سے پوچھا جائے گا کہ تم سب یہ جھوٹ کیسے باندھتے تھے۔''

﴿ وَیَجۡعَلُوۡنَ لِلّٰہِ الۡبَنٰتِ سُبۡحٰنَہٗ ۙ وَلَہُمۡ مَّا یَشۡتَہُوۡنَ ﴿۵۷﴾ ﴾

''اور وہ اللہ کے لیے بیٹیاں قرار دیتے ہیں' اللہ اس سے پاک ہے' اور اپنے لیے وہ قرار دیتے ہیں جو وہ چاہتے ہیں۔''

اور پھر بیٹیوں کے تعلق سے ان کے اپنے قبیح طرزِ عمل کا ذکر کیا گیا اور پھر آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿ وَیَجۡعَلُوۡنَ لِلّٰہِ مَا یَکۡرَہُوۡنَ ﴾ (آیت ۶۲)

''اور اللہ کے لیے وہ کچھ قرار دیتے ہیں جسے وہ خود ناپسند کرتے ہیں۔''

اور پھر دس آیات کے بعد انہی لوگوں کا تذکرہ ہے جن کے بارے میں کہا گیا کہ ''کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں!'' چونکہ ان دونوں مجموعہ آیات میں ایک طویل فصل واقع ہو گیا تھا اس لیے مناسب ہوا کہ ضمیر منفصل لا کر کہا جائے: ﴿ وَبِنِعۡمَتِ اللّٰہِ ہُمۡ یَکۡفُرُوۡنَ ﴿۷۲﴾ ﴾ اور اس ضمیر کے لانے سے وہ خدشہ باقی نہیں رہا کہ آیت ۷۲ میں جن لوگوں کا تذکرہ اچھے پیرائے میں ہوا ہے' ان کی طرف ضمیر لوٹائی جائے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ آپ نے جس خدشے کا ذکر کیا ہے وہ اس وقت قابل ملاحظہ ہوتا اگر اس آیت میں بجائے ''یُؤۡمِنُوۡنَ'' اور ''یَکۡفُرُوۡنَ'' (بصیغہ غائب) کے ''تُؤۡمِنُوۡنَ'' اور ''تَکۡفُرُوۡنَ'' (بصیغہ حاضر) کہا جاتا' اور وہ اس لیے کہ آیت ۷۲ کے شروع میں تو حاضرین کو ہی خطاب کیا گیا ہے نہ کہ غائبین کو۔ وہاں تو ''جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ'' اور ''وَرَزَقَکُمۡ'' کہا گیا کہ یہ سب ضمائر خطاب کے لیے ہیں نہ کہ غائبین کے لیے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی یہ بات اس وقت درست تسلیم کی جا سکتی تھی اگر عربی زبان میں اسلوب ''التفات'' نہ پایا جاتا۔ ''التفات'' کا مطلب یہ ہے کہ اسلوبِ کلام کو خطاب سے ایک دم صیغہ غائب سے بدل دیا جائے' یا صیغہ غائب سے کلام کا آغاز ہو اور اسے پھر فوراً صیغہ حاضر سے بدل دیا جائے۔ مثال کے طور پر ہم (امرؤ القیس کے) یہ اشعار نقل کرتے ہیں:

تطاوَل لَیْلُکَ بِالْأَثْمَدِ وَنَامَ الْخَلِیُّ وَلَمْ تَرْقُدِ

’’تیری رات سرمہ کے ساتھ طول کھینچتی گئی‘ اور دوست تو سو گیا لیکن تُو نہ سو سکا۔‘‘

وباتَ وباتَتْ لَہٗ لَیْلَۃٌ کلَیْلَۃِ ذی الْعَائِرِ الأرمدِ

’’اُس نے رات گزاری اور اس کی رات ایسے گزری جیسے اس شخص کی رات جو بدبختی اور چندھیائی ہوئی آنکھ کا شکار ہو۔‘‘

وذٰلِکَ مِنْ نبإٍ جَاءَنِی وَخُبِّرتُہ عَنْ اَبِی الأَسْوَدِ

’’اور یہ مجھے اس خبر کی وجہ سے ہوا جو مجھے ابوالاسود کی طرف سے موصول ہوئی۔‘‘

اب ملاحظہ ہو کہ شاعر پہلے خطاب کا صیغہ لا رہا ہے (لَیْلُکَ ‘ وَلَمْ تَرْقُدِ) پھر غائب کے صیغے سے کلام کر رہا ہے (باتَ‘ باتَتْ لَہٗ) اور پھر کلام کا رُخ متکلم کے صیغے کے ساتھ اپنی طرف پھیر دیتا ہے (جَاءَنِی۔ خُبِّرتُہ)۔

کتاب اللہ میں تو اس کی بہت سی مثالیں ہیں‘ صرف ایک مثال ملاحظہ ہو۔ سورۂ یونس میں ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ ......﴾ (آیت ۲۲)

’’وہی (اللہ) ہے جو تمہیں خشکی اور پانی میں چلاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم کشتی میں سوار ہوتے ہو اور پھر وہ کشتیاں ان کے ساتھ خوشگوار ہوا میں چلتی ہیں ......‘‘

دیکھئے آغازِ کلام صیغہ خطاب سے ہوا تھا اور پھر صیغہ غائب میں منتقل ہو گیا۔ اور اس تمہید سے یہ واضح ہو گیا کہ سورۃ النحل کی آیات میں بھی چونکہ اسی طرح بطرزِ التفات کلام کیا گیا ہے اور اسی لیے یہ خدشہ بدستور باقی رہا کہ ’’یُؤْمِنُوْنَ‘‘ اور ’’یَکْفُرُوْنَ‘‘ سے کہیں وہ لوگ مراد نہ لیے جائیں جن کا تذکرہ اس آیت کے شروع میں ہوا تھا‘ یعنی جن پر بیٹوں اور پوتوں سے نوازنے کا ذکر کیا گیا تھا‘ اسی لیے ضروری ہوا کہ ضمیر منفصل (هُمْ) لاکر اس بات کا یقین دلایا جائے کہ یہاں وہ لوگ مراد ہیں کہ جن کا دس آیات قبل ذکر ہوا تھا۔

اب آیئے سورۃ العنکبوت کی آیت کی طرف‘ ارشاد ہوا:

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ﴾

’’کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے امن سے بھرپور ایک حرم بنا دیا ہے اور ان کے اردگرد کے لوگ اچک لیے جاتے ہیں۔‘‘

اور اس کے بعد فرمایا:

﴿اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ۝۶۷﴾

’’تو کیا پھر وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کو ٹھکراتے ہیں!‘‘

یہاں سورۃ النحل کی مانند کوئی ایسے لوگ مراد نہیں ہیں جن کا ذکر کہیں دُور دراز ہوا ہو‘ یعنی یہاں تو وہی لوگ مراد ہیں جن کا ذکر اسی آیت میں ہوا ہے‘ اس لیے یہاں ضمیر منفصل لانے کی قطعاً کوئی حاجت نہ تھی۔ اور یوں بھی کہہ

سکتے ہیں کہ ہر دو آیات کا مضمون اپنی اپنی جگہ پر کامل و مکمل ہے اور اگر اس کا اُلٹ کیا جاتا تو وہ مناسب نہ ہوتا۔ واللہ اعلم!

(۲۱۹) آیت ۷۸

﴿وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۷۸﴾

''اور اس نے تمہارے لیے سماعت (کان) آنکھیں اور دل بنائے تاکہ تم شکر گزار بنو۔''

اور سورۃ المؤمنون میں ارشاد فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۷۸﴾

''اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے سماعت' آنکھیں اور دل بنائے' لیکن تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔''

اور سورۃ الملک میں ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۲۳﴾

''کہہ دیجیے وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے لیے سماعت' آنکھیں اور دل بنائے۔ (لیکن) تم بہت ہی کم شکریہ ادا کرتے ہو۔''

اس دوسری آیت سے ان کے شکر کرنے کی نفی کی جارہی ہے یا بتایا جارہا ہے کہ وہ بہت کم شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اور سورۃ النحل کی آیت میں ان کے شکر کرنے کی امید دلائی جارہی ہے' تو اس فرق کی کیا وجہ ہے' حالانکہ دونوں جگہ مضمون ایک ہی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے (واللہ اعلم) کہ سورۃ النحل کی آیت سے قبل ارشاد ہوا تھا:

﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـــًٔا﴾ (آیت ۷۸)

''اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا جب کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔''

یہاں ایسے لوگوں کا حال بیان ہورہا ہے جو ابھی سنِ تکلیف کو نہیں پہنچے' اور ظاہر ہے کہ جو شخص ابھی اس دنیا میں آیا ہے ابھی وہ اس عمر تک نہیں پہنچا کہ حکم بجالائے' جس چیز سے روکا جارہا ہے اس سے رک جائے' ایسے شخص سے تو امید ہی کی جاسکتی ہے کہ وہ اللہ کا شکر بجالائے گا۔ لیکن باقی دونوں آیات میں ایسے لوگ مخاطب ہیں جو سنِ تکلیف کو پہنچ چکے ہیں' خطاب کو سمجھتے ہیں' بار بار ان کو یاددہانی کرائی جاتی رہی ہے لیکن ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ملاحظہ ہو کہ سورۃ المؤمنون کی آیت سے قبل ارشاد ہوا تھا:

﴿وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ۝۷۶﴾

''اور ہم نے انہیں اپنے عذاب کا مزا بھی چکھایا لیکن وہ پھر بھی اپنے رب کے سامنے نہ جھکے' نہ گڑگڑائے۔''

ایسے ہی سورۃ الملک کی آیت سے قبل بھی تین آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے احسانات گنوائے گئے ہیں اور ان کی ناشکری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ۭ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ۝۲۰﴾

''کیا رحمٰن کو چھوڑ کر تمہارا کوئی ایسا لشکر ہے جو تمہاری مدد کر سکے۔ بے شک کافر دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔''

﴿اَمَّنۡ ہٰذَا الَّذِیۡ یَرۡزُقُکُمۡ اِنۡ اَمۡسَکَ رِزۡقَہٗ ۚ بَلۡ لَّجُّوۡا فِیۡ عُتُوٍّ وَّ نُفُوۡرٍ ﴿۲۱﴾﴾

''کیا وہ جو تمہیں روزی دیتا ہے اگر اپنی اس روزی کو روک لے؟ لیکن یہ لوگ عناد کا شکار ہیں اور بدکتے رہتے ہیں۔''

﴿اَفَمَنۡ یَّمۡشِیۡ مُکِبًّا عَلٰی وَجۡہِہٖۤ اَہۡدٰۤی اَمَّنۡ یَّمۡشِیۡ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۲۲﴾﴾

''کیا وہ زیادہ ہدایت یافتہ ہے جو اپنے منہ کے بل چلتا ہے یا وہ جو بالکل سیدھا کھڑا ہوا سیدھے راستے پر چلتا ہے؟''

یہاں بھی ان کے اوپر متعدد احسانات گنوائے گئے ہیں لیکن انہوں نے ان احسانات کی قدر نہ کی' اس لیے ''قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ'' کہہ کر ان کے شکر ادا نہ کرنے کی طرف اشارہ کرنا مناسب تھا۔

(۲۲۰) آیت ۷۹

﴿اَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیۡ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا یُمۡسِکُہُنَّ اِلَّا اللّٰہُ ؕ﴾

''کیا وہ نہیں دیکھتے پرندوں کو کہ وہ فضائے آسمانی میں کیسے پابندِ حکم (اڑتے) ہیں۔ انہیں سوائے اللہ کے اور کون تھامے ہوئے ہے؟''

اور سورۃ الملک میں ارشاد فرمایا:

﴿اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ فَوۡقَہُمۡ صٰٓفّٰتٍ وَّیَقۡبِضۡنَ ؕ مَا یُمۡسِکُہُنَّ اِلَّا الرَّحۡمٰنُ ؕ﴾ (آیت ۱۹)

''کیا وہ اپنے اوپر پرندوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ پَر کھولے ہوئے اور (کبھی) انہیں سمیٹتے ہوئے (اڑتے رہتے) ہیں۔ سوائے رحمٰن کے اور کون ان کو تھامے ہوئے ہے؟''

دونوں آیات کا مضمون ایک ہی ہے لیکن پہلی آیت میں ''اللہ'' کا ذکر ہے جو انہیں تھامے ہوئے ہے اور دوسری آیت میں لفظ ''رحمٰن'' کا ذکر ہے تو اس کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سورۃ الملک میں پرندوں کی دو حالتوں کا ذکر ہے: بسط کا اور قبض کا۔ یعنی کبھی تو پَر پھیلاتے ہوئے ان کی اُڑان جاری رہتی ہے اور اس کے بعد استراحت کا ایک وقفہ آتا ہے جس میں وہ اپنے پَر سمیٹ کر بھی اُڑتے رہتے ہیں۔ ان کی حالت تیرنے والے کی سی ہوتی ہے' یہ اللہ کی ایک نعمت ہے جو انہیں عطا ہوئی ہے اس لیے یہاں ''رحمٰن'' کا اسم الٰہی لانا مناسب تھا۔

سورۃ النحل میں اس تفصیل کا ذکر نہیں ہے یعنی قبض و بسط کے درمیان استراحت کا ہونا تو وہاں صرف اسم جلّ جلالہ (اللہ) کا لانا مناسب ہوا' واللہ اعلم! ❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی ونحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان مرحوم

سورۃ الرعد

آیات ۱ تا ۴

﴿الٓمّٓرٰ ۚ تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ ؕ وَالَّذِىۡۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ الۡحَـقُّ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا
يُؤۡمِنُوۡنَ ۝۱ اَللّٰهُ الَّذِىۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَهَا ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ وَسَخَّرَ
الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجۡرِىۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ يُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ بِلِقَآءِ
رَبِّكُمۡ تُوۡقِنُوۡنَ ۝۲ وَهُوَ الَّذِىۡ مَدَّ الۡاَرۡضَ وَجَعَلَ فِيۡهَا رَوَاسِىَ وَاَنۡهٰرًا ؕ وَمِنۡ كُلِّ
الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيۡهَا زَوۡجَيۡنِ اثۡنَيۡنِ يُغۡشِى الَّيۡلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ
يَّتَفَكَّرُوۡنَ ۝۳ وَفِى الۡاَرۡضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّزَرۡعٌ وَّنَخِيۡلٌ صِنۡوَانٌ
وَّغَيۡرُ صِنۡوَانٍ يُّسۡقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۚ وَنُفَضِّلُ بَعۡضَهَا عَلٰى بَعۡضٍ فِى الۡاُكُلِ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ۝۴﴾

ص ن و

ثلاثی مجرد سے فعل نہیں آتا۔

اَصْنٰی (افعال) اِصْنَاءً: درخت کا جڑ سے دو شاخیں نکالنا۔

صِنْوٌ: کسی درخت کی جڑ سے پھوٹنے والی مختلف شاخوں میں سے ہر ایک کو صِنْوٌ کہتے ہیں۔ تثنیہ صِنْوَانِ۔ جمع صِنْوَانٌ۔ زیر مطالعہ آیت ۴۔

ترکیب

(آیت ۱) اَلْحَقُّ خبر معرفہ ہے۔ اس سے پہلے ھُوَ محذوف ہے۔ (آیت ۲) تَرَوْنَھَا کی ضمیر مفعولی اَلسَّمٰوٰتِ کے لیے ہے۔

ترجمہ:

الٓمّٓرٰ : الٓ مٓ رٰ
تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ : یہ کتاب کی آیات ہیں

وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ : اور جو اتارا گیا
اِلَيْكَ : آپؐ کی طرف

مِنْ رَّبِّكَ : آپؐ کے رب (کی طرف) سے
الْحَقُّ : (وہ ہی) حق ہے

وَلٰكِنَّ : اور لیکن
اَكْثَرَ النَّاسِ : لوگوں کے اکثر

لَا يُؤْمِنُوْنَ : ایمان نہیں لاتے
اَللّٰهُ الَّذِيْ : اللہ وہ ہے جس نے

رَفَعَ السَّمٰوٰتِ : بلند کیا آسمانوں کو
بِغَيْرِ عَمَدٍ : ستونوں کے بغیر

تَرَوْنَهَا : تم لوگ دیکھتے ہو جن کو
ثُمَّ اسْتَوٰى : پھر وہ متمکّن ہوا

عَلَى الْعَرْشِ : عرش پر
وَسَخَّرَ : اور اس نے مطیع کیا

الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ : سورج کو اور چاند کو
كُلٌّ يَّجْرِيْ : سب رواں ہیں

لِاَجَلٍ مُّسَمًّى : ایک معیّن مدت کے لیے
يُدَبِّرُ : وہ تدبیر کرتا ہے

الْاَمْرَ : تمام کاموں کی
يُفَصِّلُ : وہ کھول کھول کر بیان کرتا ہے

الْاٰيٰتِ : نشانیوں کو
لَعَلَّكُمْ : شاید تم لوگ

بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ : اپنے ربّ کی ملاقات پر
تُوْقِنُوْنَ : یقین کرو

وَهُوَ الَّذِيْ : اور وہ، وہ ہے جس نے
مَدَّ الْاَرْضَ : پھیلایا زمین کو

وَجَعَلَ فِيْهَا : اور اُس نے بنایا اس میں
رَوَاسِيَ : پہاڑوں کو

وَاَنْهٰرًا : اور نہروں کو
وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ : اور سب پھلوں میں سے

جَعَلَ فِيْهَا : اس نے بنایا ان میں
زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ : دو جوڑے

يُغْشِي : وہ ڈھانپتا ہے
الَّيْلَ : رات سے

النَّهَارَ : دن کو
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ : بے شک اس میں

لَاٰيٰتٍ : یقیناً نشانیاں ہیں
لِّقَوْمٍ : ایسے لوگوں کے لیے جو

يَّتَفَكَّرُوْنَ : سوچ بچار کرتے ہیں
وَفِي الْاَرْضِ : اور زمین میں

قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ : باہم متصل قطعات ہیں
وَّجَنّٰتٌ : اور باغات ہیں

مِّنْ اَعْنَابٍ : انگوروں میں سے
وَّزَرْعٌ : اور کھیتی ہے

وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ : اور ایک جڑ سے کئی شاخوں والے کھجور ہیں
وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ : اور کئی بغیر شاخوں والے ہیں

يُّسْقٰى : ان کو پلایا جاتا ہے
بِمَآءٍ وَّاحِدٍ : ایک (ہی) پانی

وَنُفَضِّلُ : اور (پھر) ہم فضیلت دیتے ہیں
بَعْضَهَا : ان کے بعض کو

عَلٰی بَعۡضٍ : بعض پر
فِی الۡاُکُلِ : پھلوں (کے ذائقے) میں
اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ : بے شک اس میں
لَاٰیٰتٍ : یقیناً نشانیاں ہیں
لِّقَوۡمٍ : ایسے لوگوں کے لیے جو
یَّعۡقِلُوۡنَ: عقل استعمال کرتے ہیں

نوٹ: آیت ۳ میں اس حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے کہ اس کائنات کے ہر گوشہ میں‘ ہر چیز میں‘ آسمان اور زمین‘ سورج اور چاند‘ رات اور دن وغیرہ میں جس طرح کا تضاد اور پھر ساتھ ہی جس طرح کی موافقت پائی جاتی ہے وہ صاف صاف شہادت ہے کہ یہ کائنات مختلف دیوتاؤں کی رزم گاہ نہیں ہے‘ بلکہ اس پر ایک ہی قادرِ مطلق کا ارادہ کارفرما ہے۔ ’’مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ‘‘ کے الفاظ سے تضاد اور موافقت کے اس قانون کی ہمہ گیری کی طرف اشارہ ہے کہ جس شب و روز کے اندر یہ قانون کارفرما ہے اسی طرح ایک ایک پھل اور ایک ایک دانے کے اندر بھی کارفرما ہے‘ خواہ انسان کو اس کا علم ہو یا نہ ہو۔ گندم کے ایک دانے کو دیکھیں تو وہ بھی دو حصوں میں منقسم نظر آتا ہے‘ تاہم دونوں میں پوری وابستگی اور پیوستگی پائی جاتی ہے۔ کائنات کے ہر گوشہ کی یہ شہادت اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ یہ دنیا بھی تنہا نہیں ہے بلکہ اس کا بھی جوڑا ہے‘ اور وہ ہے آخرت۔ اپنے اس جوڑے کے ساتھ مل کر ہی یہ اپنی غایت کو پہنچتی ہے‘ ورنہ اس کا وجود بے مقصد ہو کر رہ جاتا ہے۔ (تدبر قرآن)

آیات ۵ تا ۹

﴿وَ اِنۡ تَعۡجَبۡ فَعَجَبٌ قَوۡلُهُمۡ ءَاِذَا کُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ۬ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ ۚ وَ اُولٰٓئِکَ الۡاَغۡلٰلُ فِیۡۤ اَعۡنَاقِهِمۡ ۚ وَ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۵﴾ وَ یَسۡتَعۡجِلُوۡنَکَ بِالسَّیِّئَةِ قَبۡلَ الۡحَسَنَةِ وَ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِمُ الۡمَثُلٰتُ ؕ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَذُوۡ مَغۡفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلۡمِهِمۡ ۚ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَشَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۶﴾ وَ یَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡ لَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡهِ اٰیَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ وَّ لِکُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ ﴿۷﴾ اَللّٰهُ یَعۡلَمُ مَا تَحۡمِلُ کُلُّ اُنۡثٰی وَ مَا تَغِیۡضُ الۡاَرۡحَامُ وَ مَا تَزۡدَادُ ؕ وَ کُلُّ شَیۡءٍ عِنۡدَهٗ بِمِقۡدَارٍ ﴿۸﴾ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَ الشَّهَادَةِ الۡکَبِیۡرُ الۡمُتَعَالِ ﴿۹﴾﴾

ترجمہ:

وَ اِنۡ تَعۡجَبۡ : اور اگر آپ تعجب کریں
فَعَجَبٌ : تو عجیب ہے
قَوۡلُهُمۡ : ان لوگوں کی بات (کہ)
ءَاِذَا : کیا جب
کُنَّا : ہم ہو جائیں گے
تُرٰبًا : مٹی
ءَاِنَّا : (تو) کیا ہم
لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ : ضرور ایک نئی مخلوق میں ہوں گے
اُولٰٓئِکَ : وہ لوگ ہیں
الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا : جنہوں نے انکار کیا

بِرَبِّهِمْ : اپنے ربّ کا

الْاَغْلٰلُ : طوق ہیں

وَاُولٰٓئِکَ : اور وہ لوگ

هُمْ فِيْهَا : وہ اس میں

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ : اور وہ لوگ جلدی مانگتے ہیں آپؐ سے

قَبْلَ الْحَسَنَةِ : بھلائی سے پہلے

مِنْ قَبْلِهِمُ : ان کے پہلے سے

وَاِنَّ رَبَّكَ : اور بے شک آپؐ کا رب

لِّلنَّاسِ : لوگوں کے لیے

وَاِنَّ رَبَّكَ : اور بے شک آپؐ کا رب

وَيَقُوْلُ : اور کہتے ہیں

لَوْ لَآ : کیوں نہیں

عَلَيْهِ اٰيَةٌ : انؐ پر کوئی نشانی

اِنَّمَآ اَنْتَ : کچھ نہیں سوائے اس کے کہ آپؐ

وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ : اور ہر قوم کے لیے ایک ہدایت دینے والا ہے

مَا تَحْمِلُ : اس کو جو اٹھاتی ہے

وَمَا تَغِيْضُ : اور اس کو جو سکیڑتی ہیں

وَمَا : اور اس کو جو

وَكُلُّ شَيْءٍ : اور ہر چیز

بِمِقْدَارٍ : ایک مقدار سے

الْكَبِيْرُ : جو سب سے بڑا ہے

وَاُولٰٓئِکَ : اور وہ ہیں (کہ)

فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ : ان کی گردنوں میں

اَصْحٰبُ النَّارِ : آگ والے ہیں

خٰلِدُوْنَ : ہمیشہ رہنے والے ہیں

بِالسَّيِّئَةِ : برائی کو

وَقَدْ خَلَتْ : حالانکہ گزر چکی ہیں

الْمَثُلٰتُ : عبرتناک سزائیں

لَذُوْ مَغْفِرَةٍ : یقیناً مغفرت والا ہے

عَلٰى ظُلْمِهِمْ : ان کے ظلم کے باوجود

لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ : یقیناً پکڑنے کا سخت ہے

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا : وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا

اُنْزِلَ : اتاری گئی

مِّنْ رَّبِّهٖ : انؐ کے رب (کی طرف) سے

مُنْذِرٌ : خبردار کرنے والے ہیں

اَللّٰهُ يَعْلَمُ : اللہ جانتا ہے

كُلُّ اُنْثٰى : ہر مؤنث

الْاَرْحَامُ : بچہ دانیاں

تَزْدَادُ : وہ بڑھاتی ہیں

عِنْدَهٗ : اُس کے پاس ہے

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ : (وہ) ظاہر اور پوشیدہ کا جاننے والا ہے

الْمُتَعَالِ : جو سب سے بلند ہے

نوٹ ۱ : آیت ۵ میں ہے کہ ان کی گردنوں میں طوق ہیں۔ گردن میں طوق ہونا قیدی ہونے کی علامت ہے۔ ان کی گردنوں میں طوق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی جہالت، ہٹ دھرمی، خواہشاتِ نفس اور آباء و اجداد کی اندھی تقلید کے اسیر بنے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ آزادانہ غور و فکر نہیں کر سکتے۔ ان کو ان کے تعصّبات نے جکڑ رکھا ہے۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ ۲: آیت ۷ میں جو یہ ارشاد ہے کہ ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہے‘ اس سے ثابت ہوا کہ کوئی قوم اور کوئی خطہ ٔ ملک اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے اور ہدایت کرنے والوں سے خالی نہیں ہوسکتا‘ خواہ وہ نبی ہو یا اُس کے قائم مقام نبی کی دعوت کو پھیلانے والا ہو۔ جیسا سورۂ یٰسین میں نبی کی طرف سے کسی قوم کی طرف دو شخصوں کو دعوت وہدایت کے لیے بھیجنے کا ذکر ہے‘ جو خود نبی نہیں تھے اور پھر تیسرے آدمی کو ان کی تائید کے لیے بھیجنا مذکور ہے۔ اس لیے اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہندوستان میں بھی کوئی نبی ورسول پیدا ہوا ہو۔ البتہ دعوت کو پہنچانے والے علماء کا یہاں آنا بھی ثابت ہے اور پھر یہاں ایسے ہادیوں کا پیدا ہونا سب کو معلوم ہے۔ (معارف القرآن)

آیات ۱۰ تا ۱۵

﴿سَوَآءٌ مِّنۡكُمۡ مَّنۡ اَسَرَّ الۡقَوۡلَ وَمَنۡ جَهَرَ بِهٖ وَمَنۡ هُوَ مُسۡتَخۡفٍۢ بِالَّيۡلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ﴿۱۰﴾
لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ يَحۡفَظُوۡنَهٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا
بِقَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ ؕ وَاِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوۡمٍ سُوۡٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ
دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّالٍ ﴿۱۱﴾ هُوَ الَّذِىۡ يُرِيۡكُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّطَمَعًا وَّيُنۡشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾
وَيُسَبِّحُ الرَّعۡدُ بِحَمۡدِهٖ وَالۡمَلٰۤئِكَةُ مِنۡ خِيۡفَتِهٖ ۚ وَيُرۡسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيۡبُ بِهَا مَنۡ
يَّشَآءُ وَهُمۡ يُجَادِلُوۡنَ فِى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيۡدُ الۡمِحَالِ ﴿۱۳﴾ لَهٗ دَعۡوَةُ الۡحَقِّ ؕ وَالَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ
دُوۡنِهٖ لَا يَسۡتَجِيۡبُوۡنَ لَهُمۡ بِشَىۡءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيۡهِ اِلَى الۡمَآءِ لِيَبۡلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ
بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الۡكٰفِرِيۡنَ اِلَّا فِىۡ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾ وَلِلّٰهِ يَسۡجُدُ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ
طَوۡعًا وَّكَرۡهًا وَّظِلٰلُهُمۡ بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ ﴿۱۵﴾﴾

س ر ب

سَرَبَ یَسۡرُبُ (ن) سُرُوۡبًا: پانی کا جاری ہونا‘ گھستے چلے جانا۔

سَرِبَ یَسۡرَبُ (س) سَرَبًا: پانی کا برتن سے بہہ نکلنا‘ نشیب میں اُترنا۔ ﴿فَاتَّخَذَ سَبِیۡلَهٗ فِی الۡبَحۡرِ سَرَبًا ﴿۶۱﴾﴾ (الکھف) ”تو اُس نے (یعنی مچھلی نے) بنایا اپنا راستہ پانی میں‘ نشیب میں گھستے ہوئے۔“

سَارِبٌ (اسم الفاعل): بہنے والا‘ چلنے پھرنے والا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۰

سَرَابٌ: بہتے پانی کی طرح نظر آنے والی ریت۔ دھوکہ‘ فریب۔ ﴿اَعۡمَالُهُمۡ كَسَرَابٍۢ بِقِيۡعَةٍ يَّحۡسَبُهُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً ؕ﴾ (النور:۳۹) ”ان کے اعمال ایک سراب کی مانند ہیں ریتلے میدانوں میں‘ پیاسا اس کو گمان کرتا ہے پانی۔“

م ح ل

مَحَلَ یَمۡحَلُ (ف) وَمَحِلَ یَمۡحَلُ (س) مِحَالًا: کسی کے خلاف تدبیر کرنا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۳۔

ترکیب

(آیت ۱۱) لَهٗ ‘ یَدَیۡهِ اور خَلۡفِهٖ کی ضمیریں گزشتہ آیت میں مَنۡ کے لیے ہیں۔ مُعَقِّبٰتٌ صفت ہے‘ اس کا

موصوف مَلٰٓئِکَۃ محذوف ہے۔ یَحۡفَظُوۡنَہٗ کی ضمیر فاعلی ھُمۡ' مَلٰٓئِکَۃ کے لیے ہے۔ یہ مؤنث غیر حقیقی ہے اس لیے مذکر کا صیغہ بھی جائز ہے۔ (آیت ۱۲) خَوۡفًا اور طَمَعًا حال نہیں بن سکتے اس لیے یہاں یہ مفعول لَہٗ ہیں۔ (آیت ۱۴) اگر وَالَّذِیۡنَ کو یَدۡعُوۡنَ کا فاعل مانیں تو اس کا مفعول محذوف مانا جائے گا اور لَا یَسۡتَجِیۡبُوۡنَ کی ضمیر فاعلی مفعول محذوف کے لیے ہوگی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وَالَّذِیۡنَ کو مفعول مقدم مانا جائے۔ ایسی صورت میں یَدۡعُوۡنَ کا فاعل اس کی ضمیر فاعلی ہوگی اور لَا یَسۡتَجِیۡبُوۡنَ کی ضمیر فاعلی وَالَّذِیۡنَ کے لیے ہوگی۔ ترجمہ میں ہم دوسری صورت کو ترجیح دیں گے۔

ترجمہ:

سَوَآءٌ : برابر ہے	مِّنۡکُمۡ : تم لوگوں میں سے
مَّنۡ : وہ جس نے	اَسَرَّ الۡقَوۡلَ : چھپایا بات کو
وَمَنۡ : اور وہ جس نے	جَھَرَ بِہٖ : نمایاں کیا اس کو
وَمَنۡ ھُوَ : اور جو وہ ہے (کہ)	مُسۡتَخۡفٍ : چھپنے والا ہے
بِالَّیۡلِ : رات میں	وَسَارِبٌ : اور چلنے پھرنے والا ہے
بِالنَّھَارِ : دن میں	لَہٗ : اس کے لیے ہیں
مُعَقِّبٰتٌ : پہرہ دینے والے (فرشتے)	مِّنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ : اس کے سامنے سے
وَمِنۡ خَلۡفِہٖ : اور اس کے پیچھے سے	یَحۡفَظُوۡنَہٗ : وہ حفاظت کرتے ہیں اس کی
مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ : اللہ کے حکم سے	اِنَّ اللّٰہَ : بے شک اللہ
لَا یُغَیِّرُ مَا : نہیں بدلتا اس کو جو	بِقَوۡمٍ : کسی قوم کے ساتھ ہے
حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا : یہاں تک کہ وہ لوگ بدلیں	مَا بِاَنۡفُسِھِمۡ : اُس کو جو اُن کی نفسیات میں ہے
وَاِذَآ : اور جب بھی	اَرَادَ اللّٰہُ : ارادہ کرتا ہے اللہ
بِقَوۡمٍ : کسی قوم سے	سُوۡٓءًا : کسی برائی کا
فَلَا مَرَدَّ : تو کوئی بھی لوٹانے کی جگہ (یعنی امکان) نہیں ہے	لَہٗ : اس کو
وَمَا لَھُمۡ : اور نہیں ہے ان کے لیے	مِّنۡ دُوۡنِہٖ : اس کے علاوہ
مِنۡ وَّالٍ : کوئی بھی حمایتی	ھُوَ الَّذِیۡ : وہ وہ ہے جو
یُرِیۡکُمُ : دکھاتا ہے تم لوگوں کو	الۡبَرۡقَ : بجلی کی چمک
خَوۡفًا : خوف کے لیے	وَّطَمَعًا : اور اُمید کے لیے
وَّیُنۡشِیٴُ : اور وہ اٹھاتا ہے	السَّحَابَ الثِّقَالَ : بھاری بادلوں کو
وَیُسَبِّحُ : اور تسبیح کرتی ہے	الرَّعۡدُ : بادل کی گرج

بِحَمۡدِهٖ: اُس کی حمد کے ساتھ

وَالۡمَلٰٓئِکَۃُ: اور فرشتے (بھی)

مِنۡ خِیۡفَتِهٖ: اُس کے خوف سے

وَیُرۡسِلُ: اور وہ بھیجتا ہے

الصَّوَاعِقَ: گرنے والی بجلیاں

فَیُصِیۡبُ بِهَا: پھر وہ لگاتا ہے ان کو

مَنۡ یَّشَآءُ: اسے جس کو وہ چاہتا ہے

وَهُمۡ: اس حال میں کہ وہ لوگ

یُجَادِلُوۡنَ: مناظرہ کرتے ہیں

فِی اللّٰهِ: اللہ میں

وَهُوَ: اور وہ

شَدِیۡدُ الۡمِحَالِ: تدبیر کرنے کا سخت ہے

لَهٗ: اُسی کے لیے ہے

دَعۡوَۃُ الۡحَقِّ: حق کی پکار

وَالَّذِیۡنَ: اور جن لوگوں کو

یَدۡعُوۡنَ: یہ لوگ پکارتے ہیں

مِنۡ دُوۡنِهٖ: اُس کے علاوہ

لَا یَسۡتَجِیۡبُوۡنَ: وہ جواب نہیں دیتے

لَهُمۡ: ان کے لیے

بِشَیۡءٍ: کسی چیز کا

اِلَّا: سوائے اس کے کہ

کَبَاسِطِ کَفَّیۡهِ: (وہ) اپنی دونوں ہتھیلیوں کو پھیلانے والے کی مانند ہے

اِلَی الۡمَآءِ: پانی کی طرف

لِیَبۡلُغَ: کہ وہ پہنچے

فَاهُ: اُس کے منہ کو

وَمَا هُوَ: حالانکہ نہیں ہے وہ

بِبَالِغِهٖ: پہنچنے والا اس کو

وَمَا: اور نہیں ہے

دُعَآءُ الۡکٰفِرِیۡنَ: کافروں کی دعا

اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ: مگر گمراہی میں

وَلِلّٰهِ: اور اللہ کے لیے ہی

یَسۡجُدُ: سجدہ کرتے ہیں

مَنۡ: وہ جو

فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ: زمین اور آسمانوں میں ہیں

طَوۡعًا: تابعدار ہوتے ہوئے

وَّکَرۡهًا: اور ناپسند کرتے ہوئے

وَّظِلٰلُهُمۡ: اور ان کے سائے (بھی)

بِالۡغُدُوِّ: صبح میں

وَالۡاٰصَالِ: اور شام میں

آیات ۱۶ تا ۱۷

﴿قُلۡ مَنۡ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلۡ اَفَاتَّخَذۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِیَآءَ لَا یَمۡلِکُوۡنَ
لِاَنۡفُسِهِمۡ نَفۡعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلۡ هَلۡ یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَالۡبَصِیۡرُ ۙ اَمۡ هَلۡ تَسۡتَوِی الظُّلُمٰتُ
وَالنُّوۡرُ ۚ اَمۡ جَعَلُوۡا لِلّٰهِ شُرَکَآءَ خَلَقُوۡا کَخَلۡقِهٖ فَتَشَابَهَ الۡخَلۡقُ عَلَیۡهِمۡ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ کُلِّ
شَیۡءٍ وَّهُوَ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ ﴿۱۶﴾ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِیَۃٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ

السَّيۡلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوۡقِدُوۡنَ عَلَيۡهِ فِى النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡيَةٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ ؕ
كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡحَـقَّ وَالۡبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ
فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ ﴿۱۷﴾

س ی ل

سَالَ يَسِيۡلُ (ض) سَيۡلًا : پانی کا بہہ نکلنا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۷

سَيۡلٌ (اسم ذات) : بہتا پانی‘ سیلاب۔ زیر مطالعہ آیت ۱۷

اَسَالَ يُسِيۡلُ (اِفعال) اِسَالَةً : رقیق چیز کو بہانا‘ جمی ہوئی چیز کو پگھلانا۔ ﴿وَاَسَلۡنَا لَهٗ عَيۡنَ الۡقِطۡرِ ؕ﴾ (سبا: ۱۲) ’’اور ہم نے پگھلایا ان کے لیے تانبے کے چشمے کو۔‘‘

ز ب د

زَبَدَ يَزۡبِدُ (ض) زَبۡدًا : دودھ کا مکھن نکالنا‘ پانی کا جھاگ نکالنا۔

زَبَدٌ (اسم ذات) : دھاتوں کا میل‘ پانی کا جھاگ۔ زیر مطالعہ آیت ۱۷

ج ف ء

جَفَأَ يَجۡفَؤُ (ف) جَفۡئًا : ہانڈی کا ابل کر کناروں سے بہہ نکلنا۔ کسی چیز کا رائیگاں جانا‘ بے فائدہ ہو جانا۔

جُفَاءٌ (فُعَالٌ کے وزن پر صفت) : بے فائدہ‘ رائیگاں۔ زیر مطالعہ آیت ۱۷

م ک ث

مَكَثَ يَمۡكُثُ (ن) مَكۡثًا : کسی جگہ رکنا‘ ٹھہرنا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۷

مُكۡثٌ (اسم فعل) : رکنے کا عمل‘ ٹھہراؤ۔ ﴿لِتَقۡرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكۡثٍ﴾ (الاسراء: ۱۰۶) ’’تاکہ آپؐ پڑھ کر سنائیں اسے لوگوں کو ٹھہراؤ پر یعنی رُک رُک کر۔‘‘

مَاكِثٌ (اسم الفاعل) : رُکنے والا‘ ٹھہرنے والا۔ ﴿مَّاكِثِيۡنَ فِيۡهِ اَبَدًا ۳﴾ (الکہف) ’’ٹھہرنے والے ہیں اس میں ہمیشہ۔‘‘

ترجمہ:

قُلۡ مَنۡ : آپؐ کہیے کون ہے

رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ : زمین اور آسمانوں کا ربّ

قُلِ اللّٰهُ : آپؐ کہیے (وہ) اللہ ہی ہے

قُلۡ : آپؐ کہیے

اَفَاتَّخَذۡتُمۡ : تو کیا تم لوگوں نے بنائے

مِّنۡ دُوۡنِهٖۤ : اُس کے علاوہ

اَوۡلِيَآءَ : کچھ ایسے کارساز

لَا يَمۡلِكُوۡنَ : جو مالک نہیں ہیں

لِاَنۡفُسِهِمۡ : اپنی جانوں کے لیے (بھی)

نَفۡعًا : کسی نفع کے

وَّلَا ضَرًّا : اور نہ ہی کسی نقصان کے

قُلۡ : آپؐ کہیے

هَلْ يَسْتَوِي : کیا برابر ہوتا ہے
وَالْبَصِيْرُ : اور دیکھنے والا
تَسْتَوِي : برابر ہوتے ہیں
وَالنُّوْرُ : اور نور
لِلّٰهِ : اللہ کے لیے
خَلَقُوْا : جنہوں نے پیدا کیا
فَتَشَابَهَ : پھر باہم ملتی جلتی ہو گئیں
عَلَيْهِمْ : ان پر
خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ : ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے
الْوَاحِدُ : یکتا ہے
اَنْزَلَ : اُس نے اتارا
مَآءً : کچھ پانی
اَوْدِيَةٌ : وادیاں
فَاحْتَمَلَ : تو اٹھایا
زَبَدًا رَّابِيًا : اُبھرنے والا کچھ جھاگ
يُوْقِدُوْنَ : وہ لوگ چمکاتے (یعنی پگھلاتے) ہیں
فِي النَّارِ : آگ میں
اَوْمَتَاعٍ : یا کسی سامان کی
مِّثْلُهٗ : اس کے جیسا
يَضْرِبُ اللّٰهُ : بیان کرتا ہے اللہ
وَالْبَاطِلَ : اور باطل کو
الزَّبَدُ : جھاگ ہے
جُفَآءً : رائیگاں ہوتے ہوئے
مَا يَنْفَعُ : جو نفع دیتا ہے
فَيَمْكُثُ : تو وہ ٹھہرتا ہے
كَذٰلِكَ : اس طرح
الْاَمْثَالَ : مثالوں کو

الْاَعْمٰى : اندھا
اَمْ هَلْ : یا کیا
الظُّلُمٰتُ : اندھیرے
اَمْ جَعَلُوْا : یا ان لوگوں نے بنایا
شُرَكَآءَ : کچھ ایسے شریک
كَخَلْقِهٖ : اُس کی مخلوق کی مانند
الْخَلْقُ : تمام مخلوقیں
قُلِ اللّٰهُ : آپ کہیے اللہ
وَّهُوَ : اور وہ
الْقَهَّارُ : زبردست ہے
مِنَ السَّمَآءِ : آسمان سے
فَسَالَتْ : تو بہہ نکلیں
بِقَدَرِهَا : اپنے اندازے (یعنی گنجائش) کے مطابق
السَّيْلُ : بہتے پانی نے
وَمِمَّا : اور اس (دھات) میں سے
عَلَيْهِ : جس کو
ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ : کسی زیور کی تلاش میں
زَبَدٌ : کچھ جھاگ ہوا
كَذٰلِكَ : اس طرح
الْحَقَّ : حق کو
فَاَمَّا : پس وہ جو
فَيَذْهَبُ : تو وہ جاتا ہے
وَاَمَّا : اور وہ جو ہے
النَّاسَ : لوگوں کو
فِي الْاَرْضِ : زمین میں
يَضْرِبُ اللّٰهُ : بیان کرتا ہے اللہ

❁❁❁

روایتی علم النّفس اور جدید نفسیات

مکرم محمود

انسان کے اندر معرفتِ نفس کا داعیہ اور اپنے آپ کو جاننے کا جذبہ فطری ہے۔ اس جذبے کی پرورش کا سامان فلسفیانہ اور صوفیانہ دونوں روایتوں میں مبادیات‘ ساخت اور مقاصد کے فرق کے باوجود بیک آن پایا جاتا ہے۔ یونان میں ڈیلفی کے اپالو مندر کی عمارت پر Know Thy Self کا کنداں ہونا یا صوفیاء کے ہاں من عرف نفسه فقد عرف ربه کی روایت کا شائع وذائع ہونا اسی حقیقت کا اظہار ہے۔ اسی طرح اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو فلسفیانہ الٰہیات یا مابعد الطبیعیات کا بنیادی سوال کہ وجود کیا ہے؟ بھی اس بات کو نظر انداز کر کے کہ سوال کرنے والا کون ہے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یعنی وجود کیا ہے کا سوال اگر: انسان کیا ہے؟ انا کیا ہے؟ شعور کیا ہے؟ کے سوالات کے ساتھ ہو تو پھر با معنی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی اہم ہے کہ کسی بھی تہذیب کی داخلی بنیاد ان تین سوالات کے جوابات پر ہوتی ہے: انسان کیا ہے؟ کائنات کیا ہے؟ خدا کیا ہے؟ پھر انہی سوالات سے کچھ ضمنی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً: ان میں باہمی رشتہ کیا ہے؟ ان میں مرکزی حیثیت کس کو حاصل ہے؟ خدا‘ انسان اور کائنات میں باہمی تعلق کی نوعیت اور ان میں سے کسی ایک کی مرکزی حیثیت کا تعین انسان کی کل زندگی کی سمت طے کرتا ہے اور کسی تہذیب کے خارجی مظاہر اور علوم وفنون اور ترجیحات کے تعین کا سبب بنتا ہے۔ ذیل میں چند نکات کی صورت میں روایتی علم النفس اور جدید نفسیات کی چند اساسات کا مختصر تذکرہ کیا جائے گا۔ مقصود اکیڈمک گفتگو سے پرہیز کرتے ہوئے جدید علم النفس کی کچھ بنیادوں اور عملی مظاہر کا مختصر بیان ہے۔ روایتی علم النفس کا تذکرہ ضمنی ہے کہ یہ اس کی ضد ہے اور ضد کے ذریعے ہی کسی شئے یا تصور کی صحیح معرفت ممکن ہوتی ہے۔ تُعرف الاشياء باضدادها۔

۱) مسلمانوں کے ہاں علم النفس کی نشوونما اصلاً صوفیاء کے ہاں ہوئی ہے اور یہ ان کے تصورِ حقیقت یا جہانی تصور (worldview) کے تابع تھی۔ انسان کی تخلیق کا مقصد اور اس کی موجودگی کی غرض وغایت اگر اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت ہے اور اس کے قرب کا حصول ہے تو عرفانِ نفس کی غایت بھی یقیناً یہی ہوگی کہ انسان اپنے اس مقصود ومطلوبِ حقیقی کو حاصل کر سکے اور اس کے موانع یا حائل رکاوٹوں کو دور کر سکے۔ ہمارے ہاں علم النفس کی غرض وغایت تزکیہ اور تہذیبِ نفس رہی ہے۔ معرفتِ نفس گویا ایک اعتبار سے معرفتِ رذائل وفضائل نفس ہے۔

۲) علوم ایک خلا میں وجود نہیں پاتے بلکہ وہ کسی غالب تصوّرِ حیات سے ایک بدیہی تعلق رکھتے ہیں۔ جدید علم النفس (psychology) بھی اس کی ایک مثال ہے۔ اس کا جدید تہذیب اور جدید نظامِ سیاست ومعاشرت ومعیشت سے ایک فوری اور فطری تعلق ہے۔ جدید انسان ایک فرد ہے‘ تمام رشتوں اور اجتماعیتوں سے کٹا ہوا ایک فرد جو اسیرِ جبلت ہے اور باقی انسانوں اور نظمِ اجتماعی کے ساتھ طاقت اور مفاد کے رشتے میں منسلک ہے۔ یہ انسان جو

کہ ایک تصور نہیں بلکہ حقیقت ہے‘ جدید نفسیات اس انسان کو فطری اور نارمل مان کر اپنے علمی اور عملی سفر کا آغاز کرتی ہے اور اس تصورِ انسان سے انحراف کو ابنارمیلٹی قرار دیتی ہے۔

۳) جبلت اور ذہن کے مابین ہم آہنگی کی خواہش انسان کے لیے فطری ہے۔ اس کے بغیر باطنی ٹھہراؤ ممکن نہیں ہے اور داخلی نفسی کشمکش کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہم آہنگی جبلت اور ذہن ہر دو کی مرکزیت پر ممکن ہے۔ جدید نفسیات جبلت اور ذہن کی ہم آہنگی کو جبلت کے اصول پر دریافت کرتی ہے اور جبلت کی اصل آزادی کو قرار دیتی ہے (جبلت اگرچہ بذاتِ خود ایک جبر ہے مگر یہاں آزادی سے مراد ہے کہ جبلت کسی خارجی قید یا جبر کو قبول نہیں کرے گی اور جبلت کے داخلی جبر کو انسان اپنے جملہ وسائل استعمال کر کے کم سے کم کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔ جبلت کا ہر ممکن اظہار دائرہ فطرت میں آتا ہے)۔ یعنی شعور تابعِ جبلت ہو جائے یا دوسرے لفظوں میں شعور آزادی کی قدر کو اپنی قدر الاقدار قرار دے دے۔ اس تصورِ ہم آہنگی جبلت و ذہن میں بعض اوقات جبلت کو ذہن کے تابع بھی کیا جاتا ہے مگر یہ کسی دوسری جبلت کی تسکین کے لیے ہوتا ہے نہ کہ کسی اخلاقی اصول کی بنیاد پر جو اپنی جڑیں آسمانی ہدایت میں رکھتا ہو۔ جبلتوں کے مابین لین دین بھی مفاد کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اس لین دین اور جبلتوں کے داخلی توازن کو برقرار رکھنے کے لیے شعور کو کام میں لایا جاتا ہے۔

۴) جدید نفسیات انسان کی مادی تعبیر کے اصول پر استوار ہے۔ یعنی مادہ کے اصول سے انسان کے تمام ظاہری و باطنی قویٰ کی توجیہہ کی گئی ہے۔ شعور بھی مادہ ہی کا ایک انفجائی (emergent) مظہر ہے۔ شعور کا ظہور گویا ایک خاص مادی ترتیب کا نتیجہ ہے۔ اس ترتیب کو ختم کر دیا جائے تو شعور معدوم ہو جائے گا کہ گویا تھا ہی نہیں۔ انسان کی یہ تعبیر نفسیات نظری ہو یا عملی ہر دو میں کلیدی حیثیت کی حامل ہے۔ یہی تعبیر اور اس کے مختلف مظاہر انسانی نفس کی تفہیم‘ نارمیلٹی اور ابنارمیلٹی کا تعین اور علاج کے منہج کو متعین کرتے ہیں۔ جدید مادی تصورِ حیات نے انسانی نفس کی مادی تعبیر کو ممکن بنایا‘ جو انسانی نفس کے فہم اور اس کے علاج کے منہج کو طے کرتی ہے۔ اسی کے ضمن میں وہ کلیدی اقدار اور تصورات آتے ہیں مثلاً آزادی‘ انفرادیت پرستی وغیرہ جو جدید نفسی طریق علاج میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ نفسیاتی صحت اور عدم صحت کے معیارات کا تعین کرتے ہیں۔ اگر بنظر عمیق دیکھا جائے تو نفسیاتی صحت اور عدم صحت کے معیارات کا تعلق نظاماتی مطابقت سے ہے۔ یعنی حاضر و موجود نظام‘ اس کی اقدار اور طرز ہائے احساس و عمل سے اگر آپ ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں تو آپ نارمل ہیں۔ اگر آپ ان پر ہی سوال اٹھانا شروع کر دیں تو آپ اور کچھ بھی ہو سکتے ہیں لیکن نارمل کہلائے جانے کے مستحق نہیں۔ سسٹم کے نمائندے آپ کو ان سوالات کے جوابات بھی اپنے تئیں فراہم کرتے ہیں مگر ان کی اصل کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کی پیدائش کے عمل کو اپنی بنیاد میں ہی ختم کر دیا جائے یا اس پر قابو پالیا جائے یعنی آپ کو دوبارہ سے نارمل بنا دیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مادی تعبیر سے بظاہر کچھ اختلاف رکھنے والی جدید نفسیاتی تعبیرات بھی اپنی رسائی نفس تک ہی رکھتی ہیں اور نفس کی کچھ باطنی اور خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر لینا ہی ایک کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ انسان جسم سے کچھ بلندی تو حاصل کر لیتا ہے یعنی نفسی ماورائیت کا ایک گونہ حصول تو ممکن ہو جاتا ہے لیکن روح جو اصلی ماورائیت کی حامل ہے‘ ان تعبیرات کے دائرے سے یکسر خارج ہی رہتی ہے۔

۵) عصرِ رواں میں انسان کے نفسی احساسات کو ایک بہت ہی بنیادی اہمیت دے دی گئی ہے۔ ہر نفسی احساس کو فطری قرار دے دیا گیا ہے۔ ان احساسات کی پیدائش کا عمل جدید معاشرتی صف بندی اور سسٹم کی تاثیرات سے خالی نہیں ہوتا لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ ان احساسات کا واحد منبع انسانی نفس ہے‘ جو انسانی فطرت کا مکمل اظہار ہے۔ یعنی ہر وہ خیال جو سوچا جا سکتا ہے اور ہر وہ احساس جو محسوس کیا جا سکتا ہے اور ہر وہ کام جو کیا جا سکتا ہے‘ فطری ہے۔ گویا فطرت کوئی معیار نہیں ہے بلکہ انسان کی امکانی صلاحیت فکر و احساس و عمل کا نام ہے۔ انسانی احساسات کو بنیادی اہمیت دینے کے عملی اطلاقات اور مظاہر آج کل کے دور میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً gentle parenting کے جو اصول بتائے جاتے ہیں اس میں سے ایک یہ ہے کہ بچے کی feelings کو hurt نہ کیا جائے اس سے وہ trauma کا شکار ہو جائے گا اور بچپن کے تجربات اور traumas کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس میں کیا مسئلہ ہے‘ ٹھیک ہی تو بات ہے لیکن اصل مسئلہ یہی ہے کہ کوئی اخلاقی اصول نہیں ہیں‘ گناہ ثواب کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اصل چیز اندرونی احساسات ہیں اور trauma سے بچنا ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر روک ٹوک نہیں ہوگی تو بچے کی تربیت کیسے ممکن ہوگی۔ اسی طرح اگر آپ دیکھیں تو جدید counselling اور psychotherapy بھی انہی اصولوں پر کھڑی ہے جو انسانی سوچ‘ احساس اور اظہار کی آزادی کو مرکزی اہمیت دیتی ہے۔ خاندان میں اگر کسی فرد کو کچھ مسائل کا سامنا ہے تو نفسیات دان ان مسائل کا حل یہ کبھی نہیں بتائے گا کہ آپ قربانی دیں یا کوئی اخلاقی حل پیش نہیں کرے گا بلکہ اس کی انا کو مزید ابھارے گا۔ اس کی انفرادیت کو اجاگر کر کے اس کے اظہار کی صورت میں ان مسائل کا سامنا کرنے کے طریقے سکھائے گا۔ اس انفرادیت کے اظہار کا نتیجہ اگر باقی خاندان والوں سے لاتعلقی ہو‘ جو اس کے کسی مادی مفاد سے ٹکراتی نہ ہو تو وہ اس کو یہی مشورہ دے گا۔

۶) سسٹم یا نظام‘ انسانی اقدار و تصورات اور ان کا خارجی عملی اظہار‘ جو صرف انفرادی انسانی اعمال کی شکل میں نہ ہو بلکہ اجتماعی اداروں کی شکل میں بھی ہو‘ سے مل کر وجود میں آتا ہے۔ ان اداروں میں سیاسی‘ سماجی اور معاشی ادارے ہیں جو انسانی زندگی کا مکمل طور پر احاطہ کرتے ہیں۔ نظاماتی تاثیرات صرف انسانی اعمال تک محدود نہیں ہوتیں بلکہ وہ انسانی تصورات‘ جذبات اور احساسات تک بھی اپنی رسائی رکھتی ہیں۔ جدید سماجی علوم میں ایک اصطلاح system integration کی استعمال ہوتی ہے۔ اس کا اگر سادہ اور سیدھا ترجمہ کیا جائے تو کچھ یوں مناسب رہے گا: ’’نظامِ قائمہ کا ایک چلتا پُرزہ بن جانے کا عمل‘‘۔ اس عمل میں دو جدید اداروں کا محوری کردار ہے۔ ایک جدید نظامِ تعلیم ہے جو اپنی بنیادوں میں ایک سیاسی عمل ہے‘ اخلاقی نہیں۔ سیاسی عمل سے مراد یہ ہے کہ یہ فرد کو نظمِ اجتماعی کا کامیاب حصہ بنا دیے جانے کی ایک ریاستی کوشش ہے اس بات سے قطع نظر کہ وہ نظمِ اجتماعی کن اصولوں پر اپنی اساس رکھتا ہے‘ وہ اصول اپنی کوئی ماورائی اساس رکھتے ہیں یا انسانی فکر و شعور کی اختراع ہیں۔ اچھی تعلیم کے حصول کا مطلب ہے کہ ایک فرد کے اندر سسٹم کے چلتے پُرزے بن جانے کی صلاحیت مکمل طور پر پیدا ہو جائے۔ تعلیم یافتہ ہو جانے اور ایک دفعہ سسٹم کا حصہ بن جانے کے بعد سسٹم ان کو اتنا ’’تر‘‘ رکھتا ہے کہ پُرزوں کو کوئی رگڑ نہیں لگتی اور نہ ہی کوئی حرارت پیدا ہوتی ہے۔ نظام ایک ہموار طریقے سے چلتا رہتا ہے۔ دوسرا ادارہ جدید نفسیات اور اس کے ضمنی طرق ہائے فہم و علاج ہیں۔ یہ بھی system integration ہی کا ایک میکانزم ہے مگر یہ ثانوی

ہے۔ ثانوی ان معنوں میں کہ اس کا کام جدید تعلیم کی عمل داری کے بعد شروع ہوتا ہے۔ جدید نظامِ تعلیم اگر کسی کو کامیابی کے ساتھ سسٹم کا حصہ نہ بنا سکا یا اگر حصہ تو بن گیا ہے مگر ''رگڑ'' اور ''حرارت'' پیدا ہو رہی ہے (رگڑ سے مراد کارکردگی کا تسلی بخش نہ ہونا یا inefficiency ہے۔ یہ مرض متعدی ہے یعنی باقی پُرزوں کے کام کو بھی متاثر کرتا ہے۔ حرارت سے مراد سسٹم یا نظام کے خلاف باغیانہ جذبات کا پیدا ہونا ہے۔) تو سائیکوتھراپی اس مسئلے کا حل ہے اور وہ فرد کو آزادی اور انفرادیت پرستی کے نام پر دوبارہ سسٹم کا حصہ بنانے اور نظام کو ہموار اور رواں چلتے رہنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ نظامِ تعلیم گویا پیچھے سے زور لگاتا ہے اور عملی نفسیات کا ادارہ آگے سے قابو میں رکھتا ہے۔ بنظرِ غائر اگر دیکھا جائے تو اس میں ایک تیسرا عامل بھی ہے اور اس کا کردار بھی اساسی ہے۔ وہ عامل motivational speaking کا ہے۔ اس کا کردار وسطی اور درمیانی ہے۔ یہ مشین کے چلتے پُرزوں کو مسلسل تیل دینے کا عمل ہے تاکہ سسٹم کی رواں کارکردگی برقرار رہے۔ اس کے ذریعے لوگوں کو یہ باور کروایا جاتا ہے کہ جو تم کر رہے ہو یہی تمہارے فائدے میں ہے اور جتنا کام تم کرو گے اتنا ہی پھل تمہیں ملے گا۔ ''کامیابی'' ہمیشہ سے تمہاری منتظر ہے۔ بس تمہیں ہی تھوڑی ہمت دکھانی ہے۔ لوگوں کو ان باتوں کا یقین دلانے کے لیے مذہب' تصوف' روحانیت' اخلاقیات' طبیعی اور سماجی علوم' نفسیات وغیرہ کا ایک حسین اور دلکش ملغوبہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے جو ان میں سے کسی ایک خانے میں بھی صحیح نہیں بیٹھتا۔ جدید علمِ نفسیات یہاں بھی خوب کام دیتا ہے۔

۷) جدید نفسیات میں انسان کے اندرون کی بہت اہمیت ہے۔ اندرون یہاں کوئی صوفیانہ معنوں میں استعمال نہیں ہو رہا بلکہ اس سے انسان کی جبلتوں سے متعلقہ داعیات' احساسات اور جذبات مراد ہیں۔ آج کل تو اس کا بہت ہی چرچا ہے کہ میری اندرونی نفسیاتی زندگی ہی میری شناخت کا تعین کرے گی۔ یہ گویا انسان کو نفسیانے (psychologization) کا عمل ہے جس کے بہت سے خطرناک نتائج کا ہمیں سامنا ہے۔ ان نتائج میں سے ایک موجودہ جینڈر ڈسکورس ہے جس میں انسان کے جینڈر کے تعین یا اس کی ضمنی شناخت کو اس کے ارادہ و شعور اور اس کے اندرونی احساسات کے تابع کر دیا گیا ہے اور اس کو ایک سیاسی مسئلہ بنا کر شناخت کی سیاست politics identity سو جوڑ دیا گیا ہے۔ Psychologization کا لازمی نتیجہ انسانی وجود پر اس کے نفس کی حاکمیت کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس کا تعلق بھی آزادی کے اس مطلق تصور سے ہے جس پر کُل جاہلیتِ جدیدہ کی بنیاد ہے کہ ''میرا جسم اور میری مرضی'' یا صنفی شناخت بھی مجھ پر ایک جبر ہے اس کو بھی میری آزادی کے دائرہ میں آنا چاہیے۔ نفسیات اس کے لیے بہت حد تک مدد فراہم کرتی ہے اور ٹیکنالوجیائی ترقی بہت سی حیاتیاتی قدغنوں کو کم سے کم کرتی جا رہی ہے۔

۸) ''Living a lie'' یا ''coming out'' کے جو آج کل عام سلوگنز ہیں یہ تعینِ شناخت میں اندرونی نفسیاتی احساسات کی مرکزیت کو ہی ظاہر کرتے ہیں۔ میری حقیقت تو میرے احساسات ہی سے طے ہو گی۔ میرا جسمانی ظاہر اگر میرا ساتھ نہیں دیتا آیا تو یہ جھوٹ پر مبنی زندگی تھی۔ اب مجھے اپنی حقیقی ذات کو ظاہر کرنا ہے اور ظاہر کو اپنی حقیقت کے مطابق بنانا ہے۔ اس مطابقت میں جو نفسیاتی الجھنیں اور حیاتیاتی رکاوٹیں حائل ہیں ان کو دستیاب ذرائع سے دور کرنا ہے۔

۹) انسانی نفس کی بہت سی تفہیمات ہماری روایت میں کی گئی ہیں۔ ان میں سے جو ایک عام ہے اور امام غزالیؒ نے بھی جس کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ انسانی نفس تین قوتوں سے مل کر وجود میں آتا ہے:

۱) قوتِ عقلیہ یا علمیہ ۲) قوتِ غضبیہ ۳) قوتِ شہویہ

ان کو اگر جدید اصطلاح میں بیان کیا جائے تو ذہن‘ ارادہ اور طبیعت بھی کہا جا سکتا ہے۔ ذہن کا تعلق قوتِ عقلیہ یا علمیہ سے ہے‘ ارادہ کا قوتِ غضبیہ سے اور طبیعت کا قوتِ شہویہ سے۔ روایتی نفسی علوم (چاہے ان کا تعلق کسی بھی روایت سے ہو) جن کا بنیادی تعلق انسانی نفس کی تہذیب واصلاح سے تھا قطعِ نظر اس سے کہ یہ تہذیب واصلاح خدا سے قرب کے لیے ہے‘ انکشافِ حقائق کے لیے ہے یا انسانی سعادت وکمال کے حصول کے لیے‘ سب کے ہاں ان تین میں تابع ومتبوع ہونے کی ترتیب متعین تھی یعنی طبیعت ارادہ کے تابع ہونی چاہیے اور ارادہ ذہن کے۔ (ذہن کسی کے تابع ہوگا‘ یہ ایک الگ بحث ہے اور ہر روایت میں اس کو الگ طریقے سے دیکھا گیا ہے۔ مثلاً وحی کے‘ کلی اخلاقی اصولوں کے‘ بزرگوں سے چلی آنے والی تعلیمات کے وغیرہ وغیرہ)۔

انسانی وجود کو نفسیانے (psychologization) کا عمل اس ترتیب کو لازماً الٹ دیتا ہے اور ذہن اور ارادے کو طبیعت کے تابع کر دیتا ہے (ویسے ذہن خارج میں کسی شے کے تابع نہ ہو تو طبیعت یا خواہش کے تابع ہونا اس کا مقدر ہے)۔ نہ صرف یہ بلکہ اس ترتیب کو فطری اور معیاری بھی قرار دیتا ہے اور مطلق آزادی کی قدر کے داخلی اور خارجی تحقق کے لیے ضروری بھی۔

۱۰) جدید نفسیات میں انسانی اندروں کسی بھی قسم کی ماورائیت سے یکسر خالی ہے جبکہ ہماری صوفیانہ روایت میں اندروں کی ساری معنویت ہی اس میں ماورائی عنصر کی موجودگی سے پیدا ہوتی ہے‘ اگرچہ دوسرے نفسانی اور جبلی عناصر کا انکار نہیں کیا جاتا۔ تہذیب وتزکیۂ نفس اصل میں ماورائی اور نفسانی عناصر کے مابین ہم آہنگی ہی کا نام ہے۔ جبلی اور نفسانی کا ماورائی کے تابع ہو جانا ہی نفس کا مہذب بن جانا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ اس اصول پر نفس کو ملکیت اور بہیمیت کے دو رجحانات کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ایک رجحان علوی ہے اور دوسرا سفلی۔ کسی کے نفس میں ملکیت کمزور ہوتی ہے اور بہیمیت طاقتور جبکہ کسی کے ہاں معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی کے ہاں ملکیت اور بہیمیت میں ہم آہنگی ہوتی ہے مگر کوئی ان کے درمیان مسلسل جنگ اور کشمکش کی کیفیت سے دوچار رہتا ہے۔ شاہ صاحبؒ کشمکش کے حامل لوگوں کو ’’اہلِ تجاذب‘‘ کہتے ہیں اور ہم آہنگی کے حاملین کو ’’اہلِ اصطلاح‘‘۔ ملکیت اور بہیمیت کے کمزور اور طاقتور ہونے اور ان کے درمیان ہم آہنگی اور کشمکش کی بنیاد پر شاہ صاحبؒ انسانی شخصیت کی آٹھ قسمیں بیان کرتے ہیں جو انسانی نفس پر ان کی گہری بصیرت اور عمیق نظر کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہاں مقصود اس کی تفصیل بیان کرنا نہیں بلکہ صرف اس تضاد کو ظاہر کرنا ہے جو ہمارے روایتی علم النفس اور جدید نفسیات میں پایا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ روایتی علم النفس اور جدید نفسیات دونوں بالکل متضاد مابعد الطبیعیاتی اور نظاماتی سیاق وسباق رکھتے ہیں اور دو یکسر مختلف معاشرتی نتائج اور انسانی شخصیات کو جنم دیتے ہیں۔

❁❁❁

مباحثِ عقیدہ (۱۴)

مؤمن محمود

عقیدے کے مباحث میں ہم اس وقت الٰہیات کے مبحث پر گفتگو کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کون سی صفات کا اعتقاد ہمارے حق میں واجب ہے۔ یعنی ہمیں اللہ کو ماننے کے لیے اس کے بارے میں کیا کیا ماننا ضروری ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا کیا تعارف کروایا اور اپنی کیا صفات بیان کی ہیں کہ جن کو ہم مان لیں گے تو ہمارا عقیدہ برحق ہوگا اور اگر ہم اس کا انکار کر دیں گے تو ہمارا عقیدہ حقیقت نفس الامری کے مطابق نہیں ہوگا۔ یہ اس وقت ہمارا مبحث چل رہا ہے۔ اس میں ہم نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات کو چار یا پانچ حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ پہلے ہم نے صفتِ وجودی دیکھی جو کہ ''وجود'' ہے۔ اس کے بعد ہم نے صفاتِ سلبیہ کو بیان کیا۔ صفاتِ سلبیہ وہ صفات ہیں جن میں گویا اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے کسی نقص، کمی اور احتیاج کی نفی مقصود ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم نے قدم، بقاء، مخالفہ للحوادث، قیام بالنفس اور وحدانیت پر کلام کیا۔ اس کے بعد ہم صفات معانی کی طرف گئے۔ صفاتِ معانی اور صفاتِ سلبیہ میں فرق یہ تھا کہ صفاتِ سلبیہ وجودی صفات نہیں ہیں، وہ کسی شے کے عدم کا نام ہے۔ اور صفاتِ معانی میں ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حق میں کسی صفتِ وجودی کا اثبات کرتے ہیں۔ یہاں وجودی شاید کچھ لوگوں کو سمجھ نہ آئے تو آپ وجودی کو سلبی کے متضاد کے معنی میں لیں کہ یہاں کسی شے کا سلب مراد نہیں ہے بلکہ کسی شے کا ثبوت مراد ہے۔ (صفة وجودية قديمة ثابتة لذات الله سبحانه وتعالىٰ)۔ یہ صفاتِ معانی ہیں۔ اس کے بعد ہم نے صفتِ قدرت اور صفتِ ارادہ کو بیان کیا۔ اور آج ہم صفت علم پر کلام کریں گے۔

ترتیبِ صفات

کچھ علماء نے صفتِ علم کو پہلے بیان کیا کہ صفتِ علم کے بعد صفتِ قدرت اور ارادہ ہے۔ بعد سے مراد یہاں یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات میں کوئی قبلیت اور بعدیت تو نہیں ہے لیکن منطقی اور ذہنی ترتیب میں صفتِ قدرت اور صفتِ ارادہ صفتِ علم کے بعد آئے گی۔ یعنی علم ہوگا تو قدرت ہوگی اور ارادہ ہوگا۔ صاحبِ قدرت اور صاحبِ ارادہ بغیر علم کے ہو ہی نہیں سکتا اور یہ عقلی دلیل بھی ہے۔ یعنی جو علماء اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفت علم پر اپنی دلیل قائم کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو ہستی صاحبِ قدرت ہے، صاحبِ ارادہ ہے، مستحیل ہے کہ وہ صاحبِ علم نہ ہو۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم ہے، قدرت ہے، ارادہ ہے۔ کچھ علماء اس میں سب سے پہلے صفتِ حیات کو لے کر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صفتِ حیات کوئی اضافی صفتِ وجودی نہیں ہے لیکن صفتِ حیات شرط ہے باقی تمام صفات کی۔ یعنی قدرت و ارادہ بغیر علم کے متصور نہیں ہوگا۔ تو یہ تقسیمات متفرق ہو سکتی ہیں۔ تقدیم و تاخیر جو آپ نے صفات میں کرنی ہے اس میں بہت سے زاویے ہو سکتے ہیں۔ کبھی آپ اس کی منطقی اور ذہنی ترتیب کو پیشِ نظر رکھیں تو ایک ترتیب بنے گی، اہمیت کے اعتبار سے اس کی ترتیب بنائیں تو کوئی اور ترتیب بن جائے گی۔ یعنی صفتِ قدرت اور ارادے کا انکار زیادہ ہوا ہے بنسبت صفتِ علم

کے۔ ہم نے دیکھا کہ معتزلہ کے ہاں قدرت اور ارادے میں مسائل رہے۔ معتزلہ کے ہاں صفتِ علم میں مسائل نہیں رہے لہٰذا صفتِ علم کو مؤخر کر دیا۔ یہ ذہن میں نہیں رکھنا کہ ہر تقدیم اور تاخیر ایک ہی بات پر دلالت کرتی ہے۔ یعنی کئی دفعہ یہ اشکال پیدا ہو جاتا ہے کہ جو شے پہلے آ رہی ہے وہ زیادہ اہم ہوتی ہے یا جو شے بعد میں آتی ہے وہ زیادہ اہم ہوتی ہے۔ کبھی پہلی شے بھی اہم ہو سکتی ہے' کبھی آخری شے بھی اہم ہو سکتی ہے۔ آپ نے اس ترتیب کے پیچھے وجہ ترتیب تلاش کرنی ہے۔ اگر وہ آپ کو معلوم ہو جائے تو آپ جان سکتے ہیں کہ یہاں تقدیم اور تاخیر میں اہمیت کا بیان ہے یا نہیں۔

اہلِ سُنّت کون ہیں؟

جب ہم اہلِ سُنّت کا لفظ بول رہے ہوتے ہیں تو یہ ایک بڑا عنوان ہوتا ہے۔ اس میں کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جس پر اتفاق ہوتا ہے اور وہ اصولی باتیں ہوتی ہیں۔ لہٰذا اہلِ سُنّت کے دائرہ میں داخل ہونے کے لیے ان اصولی باتوں کو ماننا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص ان اصولی باتوں کا انکار کر دے گا تو وہ اہلِ سُنّت کے دائرے سے خارج ہو جائے گا۔ جیسے ہم نے تحسین و تقبیح عقلی یا ذاتی کا مسئلہ دیکھا' اس میں ہم نے اصولی بات یہ ذکر کی تھی کہ لَاحَاکِمَ اِلَّا اللّٰہ ! یعنی لَاحکم اِلّا للّٰہ ! اب کوئی اگر اس مسئلے میں آ کر انکار کر دے یا اس میں کوئی شبہ پیدا کرے تو ضروری نہیں ہے کہ ہم اس کو اسلام سے خارج کریں گے' لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ یہ اہلِ سُنّت کے بنیادی اصولوں میں سے ایک بنیادی اصول ہے' لہٰذا اس اصول کے انکار کی وجہ سے تم اہلِ سُنّت سے خارج ہو رہے ہو۔ بنیادی اصولوں کو ماننے کے بعد بہت سی ذیلی تقسیمات ہیں۔ جیسے فقہ کو لیں۔ فقہ میں اہلِ سُنّت کے ہاں چند بنیادی اصول متفق علیہ ہیں کہ وہ قرآن اور سُنّت کو حُجّت مانتے ہیں' اور سُنّت میں خبر واحد شامل ہے۔ پھر وہ اجماع اور قیاس کو حُجّت مانتے ہیں۔ یہ کچھ بنیادی اصول ہیں جن کی بنا پر ایک شخص اہلِ سُنّت میں داخل ہو جاتا ہے۔ ان اصولوں کو ماننے کے بعد فروعات میں اور ان اصولوں کی تفصیلات میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے بہت سے مجتہدین ہوئے' جن میں امام ابوحنیفہ' امام لیث بن سعد' امام مالک' امام سفیان ثوری' امام شافعی وغیرہ رحمہم اللہ ہیں۔ اس سے پہلے صحابہؓ میں بہت سے مجتہدین تھے اور صحابہ میں بھی اختلاف ہوا۔ ان کا اختلاف اصولی بنیادوں پر نہیں تھا کہ ایک کے نزدیک قرآن حجت ہو اور دوسرا کہہ رہا ہو کہ یہ حُجّت نہیں ہے۔ یا ایک کا قول ہو کہ خبر واحد حُجّت ہوتی ہے دوسرے صحابی فرما رہے ہوں کہ خبر واحد حُجّت نہیں ہے۔ اس طرح کا اختلاف نہیں تھا بلکہ ان مسائل میں اختلاف تھا جن میں قطعیت نہیں پائی جاتی۔ یعنی ایسا واضح حکم نہیں تھا کہ جس میں کسی قسم کی دوسری رائے کی گنجائش نہ ہو۔ یعنی صحابہ سے اجتہادی اور فروعی احکام میں کثرت سے اختلاف ہوا۔

قرآن وسُنّت پر جمع ہونے سے دفع اختلافات کا واہمہ

آج کل ایسی دعوت بھی چلتی ہے کہ یہ فقہی اختلافات اس لیے ہیں کہ ہم قرآن وسُنّت سے ہٹ گئے ہیں' اگر قرآن وسُنّت پر جمع ہو جائیں تو اختلافات ختم ہو جائیں گے۔ یہ بہت اچھی بات ہے' دل کو بھانے والی بات ہے مگر درست نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ بہت سی دل کو بھانے والی باتیں ٹھیک نہیں ہوتیں۔ اس پر غور کرنا چاہیے۔ اگر قرآن وسُنّت پر جمع ہونے سے اختلاف ختم ہوتا ہے تو صحابہ میں اختلاف نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ تو قرآن وسُنّت پر جمع تھے۔ اگر تمہارے قول کے مطابق اختلاف کا سبب قرآن وسُنّت سے ہٹنا ہے تو گویا تمہارے قول

کے مطابق صحابہ قرآن وسُنّت پر نہیں تھے۔ ابن قیمؒ اپنی کتاب ''اعلام الموقعین'' میں فرماتے ہیں کہ صرف عبداللہ بن مسعودؓ اور سیدنا عمر فاروقؓ میں سو سے زیادہ فقہی مسائل میں اختلاف ثابت ہے۔ یہ دو بڑے اہلِ علم صحابہ ہیں جن کے درمیان اتنا اختلاف تھا۔ اس کے باوجود عمرؓ کی وفات ہو رہی ہے تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: مات تسعة عشر العلم آج علم کے دس حصوں میں سے نو دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یعنی عبداللہ بن مسعودؓ کے دل میں سیدنا عمرؓ کی یہ قدر ہے، لیکن اس قدر نے انہیں اس سے نہیں روکا کہ جس مسئلے میں اختلاف ہے وہ بیان نہ ہو۔ یہی اختلاف جب دورِ تدوین میں پہنچا تو فقہی مذاہب کی صورت میں آ گیا۔ یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی فقہ اصلاً فقہ حنفی بن گئی اور عبداللہ بن عمرؓ کی فقہ مالکی بن گئی۔ پھر مکہ میں سیدنا عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ تھے۔

بہرحال اہلِ سُنّت کے اندر جس طرح فقہی فروعی معاملات میں اختلاف ہوا اسی طرح عقائد کے فروعی معاملات میں اختلاف ہوا، لیکن اصولی معاملات میں نہیں ہوا۔ اصولی معاملات میں ان کا اختلاف غیر فرقوں کے ساتھ ہوا جس کی بنیاد پر انہوں نے غیر فرقوں کا رد بھی کیا اور بتایا کہ ان کے فہم میں کیا کیا مسائل ہیں۔ چنانچہ ان فروعی اختلافات کی بنیاد پر فقہی گروہوں کی مانند عقائد میں بھی ایک سے زیادہ گروہ بن گئے۔ ان گروہوں کو ہم اشاعرہ اور ماتریدیہ کہہ دیتے ہیں۔ امام ابوالحسن الاشعری کی طرف نسبت رکھنے والے کو اشعری کہہ دیتے ہیں جب کہ جو امام ابوحنیفہؒ کی فقہی اور عقیدے کی تفہیم پر ہیں، جس کو بعد کے بڑے امام، امام ماتریدی نے جو ماوراء النہر خراسان کے امام تھے، نے تفصیل سے بیان کیا، ان کو ماتریدی کہہ دیتے ہیں۔ یہ دونوں اہل سُنّت ہیں اور دونوں میں اختلاف معمولی سا ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم اس مقام سے آگے نہ جائیں گے جہاں سلف کھڑے تھے اور ہم تاویل اجمالی پر قناعت کریں گے، تاویل تفصیلی پر نہیں جائیں گے، ان کو ہم اثریہ یا محدثین کہہ دیتے ہیں یا کبھی ان کو حنابلہ بھی کہہ دیتے ہیں۔ بہرحال یہ تینوں گروہ اہل سُنّت کے دائرے کے اندر ہیں اور ان کا اختلاف فروعی ہے اصولی نہیں ہے۔ اگر آپ پوچھیں گے کہ یہ اشاعرہ اور ماتریدیہ کہاں ہوتے ہیں؟ تو فقہ شافعی اور مالکی والے عقیدہ میں اشعری ہوتے ہیں۔ یعنی وہ فقہی جہت سے مالکی ہوتے ہیں اور عقیدے کی تفہیم میں اہل سُنّت کے جس دائرے میں ہیں وہ اشعری دائرہ کہلاتا ہے۔ اسی طرح ماتریدی عموماً احناف ہوتے ہیں جو عقیدے کے فروعی اختلافات میں امام ماتریدی سے موافقت رکھتے ہیں۔ فقہ حنفی ہندوستان، سنٹرل ایشیا، افغانستان، ترکی وغیرہ میں ہے۔ یہ سارے ماتریدی مسلک والے ہیں۔ بہرحال یہی اُمّت کی اکثریت ہے۔ احناف سب سے زیادہ ہیں اور پھر شوافع اور مالکیہ ہیں۔ پھر سب سے تھوڑے حنبلی ہیں، یعنی اثریہ یا حنبلی گروہ ہے۔ تو جمہور اُمت اشاعرہ، ماتریدیہ، یعنی فقہ حنفی، مالکی، شافعی ہی شمار ہوتی ہے۔ انہی کو اشاعرہ اور ماتریدیہ کہتے ہیں اور انہی کو اہل سُنّت کہا جاتا ہے۔ ان کا اختلاف فروعی ہے۔ اس اختلاف سے کوئی دین سے خارج نہیں ہوتا اور نہ اہل سُنّت کے دائرے سے خارج ہوتا ہے۔ ان اختلافات کو ایسا نہیں سمجھنا چاہیے کہ بڑا مسئلہ ہو گیا اور اُمت اختلاف میں پڑ گئی۔ ان معاملات میں اختلاف میں نہیں پڑی کہ جو مسائل اصولی تھے۔ اس ضمن میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کا ایک کتابچہ ہے جس کا مطالعہ مفید رہے گا: ''مسلمانوں کی فرقہ بندی کا فسانہ''۔ اصل میں ہندوستان میں کچھ لوگوں نے بہت شور شرابہ مچایا کہ یہ تو اختلاف ہی کی دنیا ہے، حق گم ہو گیا ہے، ۷۳ فرقے اور ان میں سے ایک جنت میں جائے گا اور پتا نہیں وہ فرقہ کون سا ہے، کیسے پتا چلے گا؟ تو یہ سارے مسائل ہیں جو دین کی حقیقت پر شکوک

وشبہات پیدا کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ کیونکہ اگر حق غائب ہو گیا تو پھر شاید دوبارہ نبی کی بھی حاجت ہو جائے، ختمِ نبوّت کا تصور بھی ختم ہو جائے۔ اسلام کی حقانیت اور قیامت تک اس کا برقرار رہنا جیسے مسائل بھی شکوک وشبہات کا شکار ہو جائیں گے۔ ان سب مسائل کے پیچھے ایک فلسفہ کام کر رہا ہوتا ہے: اُمّت کا اختلاف۔

اُمّت کا اختلاف رحمت ہے

فروعی اختلاف کو صحابہ اور ائمہ نے رحمت کے طور پر دیکھا ہے۔ ایک حدیث روایت کی جاتی ہے: ((اختلاف اُمّتی رحمة)) ''میری اُمّت کا اختلاف رحمت ہے۔'' یہ حدیث اگرچہ سنداً ثابت نہیں ہے، لیکن اس طرح کے اختلاف صحابہ اور ائمہ سے ثابت ہیں۔ یعنی یہ معنی درست ہے کہ اس فروعی اختلاف کو کبھی بھی زحمت نہیں سمجھا گیا بلکہ رحمت کے طور پر دیکھا گیا اور اس کی وجہ سے وسعت پیدا ہوئی۔ بلکہ عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ مجھے دنیا ومافیہا مل جائے اس کے بدلے میں کہ صحابہ اختلاف نہ کرتے ہوں۔ یعنی مجھے صحابہ کا اختلاف کرنا دنیا ومافیہا سے زیادہ پسند ہے، کیونکہ اس اختلاف کے نتیجے میں جو رحمت اور وسعت پیدا ہوئی وہ دنیا ومافیہا (دُنیوی متاع) سے زیادہ عزیز ہے۔ اسی طریقے پر امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے اقوال ملتے ہیں۔ امام مالک کو جب کہا گیا کہ آپ کی ''موطا'' کو ملک کا قانون بنا دیتے ہیں یعنی اس کو نافذ کر دیتے ہیں تو انہوں نے منع کیا کہ صحابہ مختلف علاقوں میں پھیل گئے تھے اور سب کے اپنے اپنے اجتہادات ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے اجتہاد کو سب پر لاگو کر دیا جائے۔ یہ بات ذہن میں رکھیے اور اس کو پریشان ہوئے بغیر سن لیجیے کہ فروعات میں اختلاف ہے اور یہ غیر مضر ہے۔ کیونکہ شیطان کئی دفعہ عجیب وغریب شکوک وشبہات پیدا کر دیتا ہے کہ ان میں کسی چیز پر اتفاق ہی نہیں ہوتا، حالانکہ اصلاً اتفاق ہے۔ اہل سُنّت کے عقائد میں اصلاً ننانوے فیصد جو جنت میں داخلے اور جہنم سے دوری کا سبب ہیں ان سب پر اتفاق ہے۔ باقی کچھ فروعی مسائل ہیں جن میں اختلاف ہو جاتا ہے جو وسعتِ نظری اور وسعتِ ظرفی کی دلیل ہے۔

امام بیہقیؒ کی تواضع

صفتِ علم کے حوالے سے ہم نے طے کیا تھا کہ امام بیہقی کی کتاب سے کچھ مطالعہ کریں گے۔ وہ کتاب ہے: ''الاسماء الصفات''، جس کو کچھ عرصے پہلے علامہ زاہد الکوثری جو ایک بڑے عالم تھے، انہوں نے اپنی تحقیق سے شائع کیا تھا۔ امام بیہقی شوافع میں سے تھے۔ صفت علم کے حوالے سے ایک عجیب بات عرض کر دوں کہ ہمارے جو بڑے بڑے علماء تھے اگر ہم ان کے زمانے میں ہوتے تو شاید ان کا جوتا اٹھانے کی بھی عزت حاصل نہ ہوتی، یعنی ان کا جوتا اٹھانے کے لیے جتنے علم کی ضرورت ہوتی وہ علم بھی ہمارے اندر نہیں ہے۔ اس درجے تک پہنچنے کے لیے بھی کافی مہارت حاصل کرنی پڑے گی۔ یہ جو بڑے بڑے لوگ تھے ان سے پوری تاریخ بھری ہوئی ہے۔ ان بڑے ائمہ میں امام بیہقیؒ بھی ایک نام ہے۔ یہ سب کے سب صاحبانِ علم تھے، لیکن غایت درجے کی تواضع کا یہ عالم ہے کہ امام بیہقیؒ کے بارے میں بعض علماء نے کہا کہ فقہ میں بھی اجتہادِ مطلق کے درجے تک پہنچے ہوئے تھے مگر انہوں نے اپنے لیے اجتہاد مطلق کا دعویٰ کہیں نہیں کیا اور اپنے آپ کو بس شافعی کہلوایا کہ میں امام شافعیؒ کا مقلد ہوں۔ اسی طرح وہ علماء جن کو ہم جانتے ہیں کہ وہ علم کی دنیا میں معراج تک پہنچے ہیں اور کئی دفعہ ان سے ایسے اقوال بھی برآمد ہوئے۔ جیسے مثلاً تحدیثِ

نعمت کے طور پر امام غزالیؒ کہ جب ان پر کچھ لوگوں نے آخری زمانے میں کافی اعتراضات کیے تو انہوں نے غصہ میں آ کر یوں کہہ دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو مجھ پر اعتراض کر رہے ہیں حالانکہ یہ میری لکھی ہوئی تحریروں کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ یعنی ان کے اندر یہ اہلیت نہیں ہے۔

موجودہ دور میں بھی یہ کچھ ہو رہا ہے۔ یوٹیوب پر آپ کو سینکڑوں ویڈیوز دستیاب ہو جائیں گی کہ جن میں ایک لڑکا بیٹھا بتا رہا ہوگا کہ امام غزالی کافر کیوں ہے یا بدعتی کیوں تھا۔ اس پر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی کہ کس زوال کا شکار ہو گئے۔ اسی طرح بڑے بڑے امام' مثلاً امام رازیؒ کن بنیادوں پر کافر شمار ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ہم لوگ جو مسائل خلافیات میں پڑے ہیں' جو آج کل کے مسائل ہیں کہ رفع الیدین پر کیا دلیل ہے اور عدم رفع الیدین پر کیا دلیل ہے؟ اور پھر آمین بالجہر کہنی ہے یا نہیں کہنی؟ اور امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ پڑھنی ہے یا نہیں پڑھنی؟ حدیث کی کتابیں کھول کر تحقیقات کر رہے ہوتے ہیں۔ تو عمر کا ایک اچھا خاصا حصہ اس طرح کی خلافیات میں لگ جاتا ہے' جس کا نتیجہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ آخر میں یہی ہوگا کہ دماغ خراب ہوگا اور عمر کا ایک حصہ ضائع ہو جائے گا۔ اس حوالے سے امام غزالیؒ کتاب العلم (احیاء) میں ایک جگہ اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''مجھے کیا ہے ان مسائل خلافیات سے' میں تو امام شافعی کا مقلد ہوں' جو انہوں نے فرمایا اس پر عمل کر لوں گا۔'' یہ امام غزالی فرما رہے ہیں! اور یہ قول ایسا ہے کہ جس کو آج کے دور کا عام آدمی اپنے لیے اہانت سمجھے گا کہ میں اپنے بارے میں یہ کہوں کہ مجھے یہ دلائل سمجھ میں نہیں آتے اور میں فلاں کا مقلد ہوں اور میں تو ان کے قول پر چل رہا ہوں۔ یہ تو میں بھی اپنے بارے میں تسلیم نہیں کروں گا۔ میں کہوں گا کہ میں اتنا عام آدمی نہیں ہوں' میں دلائل کو سمجھ لوں گا اور میں دیکھوں گا کہ امام ابوحنیفہؒ کا قول کن بنیادوں پر ہے' اور اگر وہ ان بنیادوں پر ٹھیک ثابت نہ ہوا تو میں رد کر دوں گا۔ یہ دلیل اس بات کی ہے کہ علم زوال پذیر ہوتے ہوتے اس سطح پر آ چکا ہے کہ اپنے بارے میں علم کا واہمہ ہو گیا اور یہ زوال کی انتہا ہوتی ہے کہ انسان غرور' خنّاس اور وساوس میں مبتلا ہو جائے اور آج ہم سب اس میں مبتلا ہیں۔ آج ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ کچھ بتانے کے قابل ہے' اس کے پاس پوری دنیا کے مسائل کا حل ہے اور دین کے مسائل میں اس کی خاص تحقیق ہے۔ آپ کو چلتے پھرتے سڑک پر ایسے لوگ نظر آ جاتے ہیں جن سے قرآن سے ناظرہ پوچھیں تو وہ صحیح نہیں سنا سکیں گے' لیکن ان کی ویڈیوز میں تمام مسائل زیر بحث آتے ہیں اور وہ دوسروں کو تبلیغ کر رہے ہوتے ہیں۔ پھر وہ سمجھتے ہیں کہ ہم تو دلیل کے پیچھے چل رہے ہیں۔ ان سے پوچھا جائے کہ دلیل کیا ہوتی ہے تو انہیں کچھ پتا نہیں۔ دلیل کیا ہوتی ہے' دلیل کی شرائط کیا ہیں' کب وہ قابل قبول ہوتی ہے' برہانی دلیل کیا ہے' جدلی دلیل کیا ہے' سوفسطائی دلیل کیا ہے؟ مقدمہ کیسے بنتا ہے' دلیل مدلول تک کیسے پہنچاتی ہے' اس کا پتا کچھ نہیں ہوگا' خبر تک نہیں ہوگی۔ لیکن دعویٰ کریں گے کہ ہم منطق اور دلیل پر چلتے ہیں' ہم دلیل سے بات سنتے ہیں۔ اللہ کرے کہ آپ دلیل سے بات سنتے ہوں۔

صفاتِ خداوندی کے نقیضین کا اپنے بارے میں گمان کرنا بندہ کے لیے لازمی ہے

بہر حال ہم صفت علم کا مطالعہ کرنے جا رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی صفت علم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم جیسے امام غزالی فرماتے ہیں کہ ہم اپنے اندر متضاد تصورات پیدا کریں' اس میں سب سے پہلے اپنے آپ کو جاہل مطلق سمجھنا ہے۔ یعنی اگر اللہ ''العالم'' ہے تو تواضع یہ ہے کہ لاعلم لنا۔ جیسے فرشتوں نے کہا: ﴿لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا

عَلَّمْتَنَاؕ﴾ (البقرۃ:۳۲) ’’ہمیں کوئی علم حاصل نہیں سوائے اُس کے جو آپ نے ہمیں سکھا دیا ہے۔‘‘ اور رسولؑ بھی قیامت کے دن یہی کہیں گے۔ ﴿یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَاؕ﴾ (المائدۃ:۱۰۹) یعنی جس دن اللہ تعالیٰ رسولوں کو جمع کر کے پوچھے گا کہ تمہیں تمہاری قوموں نے کیا جواب دیا؟ تو وہ کیا کہیں گے: ’’ہمیں کوئی علم ہی نہیں ہے۔‘‘ نعوذ باللہ کیا وہ جھوٹ بول رہے ہیں؟ یعنی ’’لَا عِلْمَ لَنَا‘‘ انہوں نے کیوں کہا۔ کیا انہیں اتنا معلوم نہیں تھا کہ ہم اپنی قوموں کے پاس گئے تو انہوں نے یہ کہا‘ ہمیں انکار کیا۔ انہیں پتا ہوگا لیکن پھر یہاں ’’لَا عِلْمَ لَنَا‘‘ کیوں کہہ رہے ہیں؟ اور یہاں لائے نفی جنس ہے جس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارے پاس کوئی خاص درجے کا علم نہیں ہے۔ بلکہ ’’لَا عِلْمَ لَنَا‘‘ کا مطلب ہے کہ جس کو علم کہتے ہیں اس جنس نامی کوئی شے ہی نہیں ہے۔ وہ برحق کہہ رہے ہیں‘ کیونکہ وہ جس کے سامنے کھڑے ہو کر کہہ رہے ہیں واقعی اس کے علم کے مقابلے میں ان کے پاس علم نامی کوئی شے نہیں ہے۔ یعنی خدا کے علم کا‘ چاہے وہ رسولوں کا علم ہی کیوں نہ ہو‘ کوئی تقابل نہیں ہے! وہ لامحدود علم والا ہے۔ البتہ رسولوں کا علم مخلوق میں سب سے بڑھ کر ہوتا ہے‘ لیکن خالق کے مقابلے میں وہ پھر کالعدم ہو جاتا ہے۔ ﴿لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَاؕ﴾۔ اس کی دوسری تفسیر یہ بیان کی گئی کہ خدا کے سامنے ان پر جو ہیبت طاری ہوگی اس کی وجہ سے وہ یہ کہیں گے۔ کیونکہ جب خدا پوچھے گا کہ بتاؤ تمہارے ساتھ کیا ہوا تو ان کو کوئی جواب نہیں سوجھے گا خدا کی عظمت اور ہیبت کی وجہ سے۔ اور ایسا ہوتا ہے کہ عظمت اور ہیبت کے مقام پر انسان کے تمام علوم رخصت ہو جاتے ہیں‘ اس کو واقعی کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ تو یہ بھی ایک جواب ہے جو اس آیت کی تفسیر میں دیا گیا۔

بہر حال ہم علم حاصل ضرور کریں‘ لیکن اللہ کے رسول ﷺ کی مستقل دعا مستحضر رہے: رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ’’اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما۔‘‘ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہمیشہ اپنے علم میں اپنے آپ کو ناقص دیکھ رہے ہیں۔ یعنی وہ ہستی کہ جس نے کہہ دیا ہے اور اپنے کہے پر ایمان لانا اس کے لیے بھی ضروری تھا کہ ((انا أعلمکم باللّٰہ)) (صحیح البخاری) ’’میں تم میں سے سب سے زیادہ اللہ کو جانتا ہوں۔‘‘ یعنی اللہ کے بارے میں سب سے بڑھ کر علم مجھے حاصل ہوا اور وہ ہستی مستقل اس حالت میں ہے کہ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا۔ یعنی وہ سب سے بڑھ کر یہ سمجھتا ہے کہ یہ کم ہے اور اس میں مزید مستقل اضافہ ہونا چاہیے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم بھی ہے: ﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾﴾ (طٰہٰ)۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی مستقل دعاؤں میں یہ شامل تھی۔ جیسے ہم دعاؤں میں پڑھتے ہیں: ((اَللّٰھُمَّ انفَعْنا بِمَا عَلَّمْتَنَا وَعَلِّمْنَا مَا یَنْفَعُنَا وَزِدْنَا عِلْمًا)) اور ((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَّرِزْقًا طَیِّبًا وَ عَمَلًا مُتَقَبَّلًا وَدَعْوَۃً مُسْتَجَابًا)) اب ہم اس امام بیہقیؒ کی کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں۔

باب ماجاء فی اثبات صفۃ العلم (ص۱۱۵)

اللہ تعالیٰ کی صفت علم کے اثبات میں جو کچھ آیا اس کا بیان۔

قَوْلُ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ﴾ ’’اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم میں سے کسی شے کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جو وہ چاہے‘‘۔ اب یہاں دلیل بنی ہے: عِلْمِہٖ۔ ہ کی ضمیر لفظ جلالہ کی طرف لوٹ رہی ہے‘ یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ۔ نحو کی تعلیم کے دوران ایک ادب سکھایا جاتا ہے کہ جب ضمیریں لوٹائی ہوں تو آپ یہ کہیں کہ یہ

ضمیر اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے تو یہ کچھ بے ادبی سی شمار ہوتی ہے۔ یہ کہا جائے کہ مفعول کی ضمیر یا مضاف الیہ کی ضمیر اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے تو یہ اچھا نہیں لگتا۔ اس کی جگہ آپ کہیں گے ضمیر لوٹ رہی ہے لفظ جلالہ کی طرف۔ اور لفظ جلالہ اللہ کا لفظ ہے۔ علم مضاف ہے‘ مضاف الیہ ضمیر ہے جو لفظ جلالہ کی طرف لوٹ رہی ہے‘ تو علم کی نسبت اللہ کی طرف ہو گئی۔ اور یہی ثابت کرنا تھا: علم اللّٰہ۔ اللہ کا علم۔ تو صفت علم کا اثبات ہو گیا۔

اللہ کو صرف عالم ماننا کافی نہیں بلکہ صفتِ علم کا اثبات بھی ضروری ہے

صرف اس بات کا اثبات نہیں ہوا جو معتزلہ نے کہا: اللہ عالم ہے‘ مان لیتے ہیں لیکن صفت علم کا اثبات نہیں کریں گے۔ یہاں اللہ کو صرف عالم نہیں کہا بلکہ علمہٗ آ گیا تو اب معلوم ہو گیا کہ اللہ نہ صرف عالم ہے بلکہ ”عالم بعلمه“ ہے۔ تو یہ دلیل بنا رہے ہیں۔ اب آگے کچھ شرح بھی کرتے ہیں۔ یقول: یعنی اللہ تعالیٰ یہ کہہ رہے ہیں: لا یعلمون الا بتعلیمه! وہ کچھ نہیں جانتے مگر جو اللہ سکھا دے اور اللہ کے سکھانے سے جانتے ہیں۔ سادہ سی تفسیر ہے‘ ظاہر ہے اللہ کے بتانے سے ہی جانا جاتا ہے۔ مگر غور کریں تو یہ اصل میں کسی گروہ کا رد کر رہے ہیں۔ اس کو اس طرح دیکھیں کہ جب آپ کسی بھی عالم کی کوئی کتاب یا اس کی تفسیر پڑھ رہے ہوں اور اس میں آپ کو کچھ جملے نظر آئیں جو آپ کو اپنے ماحول کے اعتبار سے بالکل سادہ سے نظر آئیں گے۔ ہم مانتے ہیں کہ یہ سادہ سی بات ہے کہ اللہ ہی سکھاتا ہے تو علم حاصل ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ ایک زمانہ ایسا رہا ہے جس میں فلاسفہ بہت غالب رہے ہیں۔ امام بیہقیؒ کے زمانے میں بھی موجود تھے‘ جن کا پورا ایک مدرسہ فکر تھا۔ اسی زمانے میں ابن سینا جیسے لوگ بھی ہیں۔ ان سب کا اللہ کے علم کے بارے میں ایک خیال اور تصور تھا۔ اور اللہ کے علم کے بارے میں اصل گمراہی کا مظاہرہ فلاسفہ نے ہی کیا ہے جبکہ معتزلہ یہاں پر اللہ کے فضل سے ٹھیک جگہ پر ہیں۔ البتہ معتزلہ کے ایک گروہ قدریہ اوائل نے علم ازلی کا انکار کیا ہے لیکن وہ بہر حال ختم ہو گئے۔ یعنی معتزلہ نے اس opinion کو اختیار نہیں کیا بلکہ وہ اس بات پر کھڑے تھے کہ اللہ کا علم صادق‘ علم ازلی حتمی ہے۔ جو بھی ہوتا ہے اللہ کے علم کے مطابق ہوتا ہے اور وہ اس تقدیر کو مانتے تھے۔ لیکن اہل سُنّت نے کہا کہ تقدیر کو ماننے کے لیے صرف علم نہیں بلکہ صفت ارادہ کا بھی اثبات کرو کہ جو کچھ ہوتا ہے علم کے مطابق ہوتا ہے اور اللہ کی مراد بھی ہوتی ہے۔ بس یہ اضافہ ضروری ہے۔

فلاسفہ کا تصوّرِ الٰہ و نبوت

فلاسفہ نے کہا کہ چونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کائنات کی علت اولیٰ ہے۔ ان کے ہاں علت اولیٰ کا مطلب یہ تھا کہ جب علت کامل ہوتی ہے تو معلول اس سے خود بخود وجود میں آ جانا چاہیے‘ لہٰذا وہاں ارادے کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ وہ ایجاب‘ فیضان‘ فیض کے ذریعے معلول وجود میں آتا ہی ہے تو وہاں سے مستقل فیض ہے۔ اور یہ فیض کسی کو زیادہ ہو رہا ہے کسی کو کم ہو رہا ہے تو یہ کیوں ہو رہا ہے۔ گویا وہاں سے اللہ کی طرف سے علم کا فیضان بھی جاری ہے۔ علم کا ایک سیلاب ہے اور ایک سمندر ہے جو بہہ رہا ہے لیکن کسی کو زیادہ مل رہا ہے کسی کو کم مل رہا ہے۔ کیا وہ اللہ کے ارادے سے کم اور زیادہ مل رہا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ اللہ کے ارادے سے کم اور زیادہ نہیں مل رہا ہے‘ وہاں سے تو چیزیں جاری ہو رہی ہیں‘ البتہ جس کو کم مل رہا ہے اس کو اپنے کسی نقص کی بنیاد پر کم مل رہا ہے‘ جس کو زیادہ مل رہا ہے اس کو اپنی ہی کچھ طہارت

اور صفائی کے اعتبار سے زیادہ مل رہا ہے۔ اللہ سے علم لینے کا ذریعہ کیا ہے؟ وہ کہہ رہے ہیں کہ اس کا ذریعہ یہ ہے کہ اپنے باطن کو پاک صاف کرتے چلے جاؤ تو تمہارے اوپر خود بخود لوح محفوظ سے علوم وارد ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے پھر نبوت کی explanation بھی یہی دے دی۔ انہوں نے کہا کہ نبی بھی اصل میں ایک پاکیزہ نفس ہوتا ہے تو گویا اس کے لوحِ قلب پر علوم لوحِ محفوظ سے منقوش ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس میں ان چیزوں کا دخل نہیں ہوتا کہ فرشتہ آیا' اس کو اللہ نے اپنی مرضی سے بھیجا' اللہ چاہتا تو رسول نہ بناتا۔ ایسا نہیں ہوتا بلکہ رسول واقعی اس طرح کا انسان بن چکا تھا کہ اُس کا رسول اس معنی میں بننا ضروری تھا' یہ ہونا ہی تھا۔ انہوں نے اللہ کو فاعل مختار نہیں مانا' ارادہ نہیں مانا۔ کسی کو رسول بنانا یا نہ بنانا یہ اللہ کا اختیار ہے اور رسالت اصلاً وہبی ہوتی ہے' کسبی نہیں ہوتی۔ ان کے قول کے مطابق اصلاً رسالت بھی کسبی ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ اس کا واضح طور پر اقرار نہیں کرتے لیکن یہ لازمہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر تم علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو ایسا نہیں ہے کہ اللہ سے دعا کرو کہ اے اللہ مجھے علم دے دے تو اللہ اپنی مرضی سے دے دے گا۔ نہیں! وہ کہتے ہیں کہ اپنی ایک خاص ہیئت بناؤ' اپنے اندر ایک خاص قابلیت پیدا کرو تو علوم خود بخود وارد ہو جائیں گے۔

رسالت کسبی نہیں ہے وہبی ہے

ہمارے علماء اس کا انکار کر رہے ہوتے ہیں جب وہ یہ بتاتے ہیں کہ اللہ ہی کی مشیت سے جتنا علم حاصل ہوتا ہے' ہوتا ہے۔ یعنی جب یہ کہہ دیا گیا: ﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ اور یہ جو مشیت کا لفظ آ گیا تو پتا چلا کہ وہاں سے علم فیضان کے طریقے پر' بہاؤ کے طریقے پر اور ایجاب کے طریقے پر' علت اولیٰ کے طریقے پر منتقل نہیں ہو رہا' بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مشیت کے تابع ہو کر ہو رہا ہے۔ وہ جس کو چاہے علم دے دے اور جس کو چاہے علم نہ دے۔ فرمایا: ﴿عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۝۶۵﴾ (الکھف) یعنی ہم نے بس اپنی طرف سے دے دیا۔ ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ﴾ (الانعام:۱۲۴) اللہ کو پتا ہے کہ وہ کہاں رسول بنائے گا اور کہاں نہیں بنائے گا۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ ہمارے ہاں رسالت بالکل ایک وہبی شے ہے۔ اور وہبی مانیں گے تب آپ یہ مانیں گے کہ رسالت کا دروازہ اصلاً بند ہو چکا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ﴾ (الحج:۷۵)

''وہ اللہ ہے جو فرشتوں میں سے بھی رسولوں کو چن لیتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔''

اب اگر یہ تفصیل بیان کریں گے تو اس کے بعد امام بیہقی کا قول آپ کو عام نہیں لگے گا۔ پتا چلے گا کہ اس میں ایک خطرناک قسم کی بات کا رد ہوا ہے جو اُس زمانے میں پھیلی ہوئی بات تھی۔ جس زمانے میں بھی یہ باتیں پھیلتی ہیں وہ کسی ایک خاص حلقے تک نہیں ہوتیں بلکہ اس کا اثر عوام الناس تک پہنچتا ہے۔ لوگ متاثر ہو رہے ہوتے ہیں اور سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ فلاسفہ کے دلائل تو بڑے زبردست ہیں۔ جیسے آج کل بھی ہوتا ہے کہ کئی دفعہ ہم پختہ علم نہ ہونے کی بنیاد پر بہت سے لوگوں کو سنتے ہیں اور وہ اصلاً اہل سُنّت سے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اُس زمانے میں بھی ایسے لوگ تھے جو کہتے تھے کہ میں اس کی بات سے متاثر ہو گیا ہوں۔ ہر چیخنے والا آ کر چیختا ہے تو اس کے پیچھے چلنے والے لوگ چل پڑتے ہیں' متاثر ہو رہے ہوتے ہیں' اسی طرح اُس زمانے میں بھی ہو رہے تھے۔ معتزلہ اپنے زمانے کے intellectuals تھے' ان سے بڑے بڑے دماغ متاثر ہو رہے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ عام آدمی تھے۔ اسی طرح فلاسفہ نے بھی بہت بڑے لوگوں کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

اہتمام حفاظتِ اُمّت

چونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اُمّت میں ایک حفاظت کا اہتمام فرمایا ہوا تھا تو ایسے ایسے لوگ پیدا ہوتے چلے گئے جنہوں نے اس انحراف کو درست کیا اور رد کیا۔ چنانچہ اللہ کے فضل وکرم سے وہ سب فرقے غائب ہوتے چلے گئے جو کسی زمانے میں جھاگ کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ آج کل بھی ایسا ہی ہوگا' ان شاء اللہ! اگرچہ ہم ضعیف ہیں اور علم میں بھی زوال ہے' لیکن چونکہ یہ دین ہمیشہ کے لیے آیا ہے' اس میں ایک خدائی حفاظت کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ ہمیں صرف انسانی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے کہ لگتا ہے کہ زوال کا زمانہ آ گیا' مسلمانوں میں کچھ نہیں رہا اور دین میں بھی کچھ نہیں رہا۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ دین محفوظ ہے اور اسی وجہ سے ہم جیسے لوگوں کو بھی صحیح باتیں پہنچ گئیں۔ اگرچہ کنفیوژن' ضلالت' گمراہی اور فتنوں کا دور ہے لیکن کوئی شخص اگر صحیح نیت سے دین حق کی تلاش میں لگے اور صحیح بات تک پہنچنا چاہے تو اس کو مل بھی جائے گی۔ یعنی یہ کوئی فترت کا زمانہ نہیں ہے کہ حق بات رخصت ہو چکی۔ بہرحال امام بیہقیؒ یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ ﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ میں بِمَا شَآءَ کی قید کتنی اہم ہے' اس سے بہت سے تصورات کا رد ہو رہا ہے۔ اس کے بعد اگلی آیت لے کر آتے ہیں: وقال جل وعلیٰ:

﴿قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ⑬ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ⑭﴾ (ھود)

آپؐ کہیے کہ اچھا تم لوگ بھی لے آؤ اس جیسی دس سورتیں گھڑی ہوئی اور (اس کے لیے) بلا لو تم جس کو بھی بلا سکتے ہو اللہ کے سوا' اگر تم سچے ہو۔ پھر اگر وہ (تمہارے مددگار) تمہارے اس بلانے کو قبول نہ کریں تو جان لو کہ یہ اللہ ہی کے علم سے نازل ہوا ہے اور یہ کہ کوئی معبود نہیں ہے سوائے اُس کے۔ تو کیا اب تم سرِ تسلیم خم کرتے ہو؟''

﴿فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ﴾ کے دو مطلب کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ بامصاحبت کا ہے۔ بائے مصاحبت کا مطلب ہوگا جو قرآن مجید نازل ہوا اس میں بھی اللہ کا علم ہے۔ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کلام ہے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علوم کا مخزن بھی ہے۔ اس کے اندر بھی اللہ کے علوم موجود ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ باسببیہ ہے یعنی ایسا قرآن اللہ کے علم کی بدولت اترا ہے' اللہ کے علم کے سبب اترا ہے۔ یہ سب تعبیریں ہو سکتی ہیں۔ تو یہاں اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ میں اصلاً علم کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے۔ اسی طرح ایک اور آیت کا حوالہ دیا ہے:

﴿لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ﴾ (النساء:۱۶۶)

''بلکہ اللہ تو گواہی دیتا ہے کہ اُس نے (اے نبی ﷺ) جو کچھ آپ پر اتارا ہے اپنے علم کے ساتھ اتارا ہے۔''

اب یہاں بھی بِعِلْمِهٖ کی وہی تفسیر ہے جو میں نے کر دی۔ اسی طرح فرمایا:

﴿اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ۭ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَآءِيْ ۙ قَالُوْٓا اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيْدٍ ㊼﴾ (حٰم السجدة)

''اُسی کی طرف لوٹتا ہے قیامت کا علم۔ اور نہیں نکلتے کوئی پھل اپنے غلافوں سے اور نہ کسی مادہ کو حمل ہوتا ہے

اور نہ ہی وہ اس کو جنتی ہے، مگر اُسی کے علم سے۔ اور جس دن وہ ان کو پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک؟ وہ کہیں گے: ہم نے تو آپ سے عرض کر دیا ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس کی گواہی دینے والا نہیں۔''

اس طرح کی آیات سے علماء استدلال کرتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی علم صرف کلیات کا علم نہیں ہے بلکہ جزئیات کا علم ہے۔ اللہ اپنی مخلوق میں سے ہر جزو کو جانتا ہے' ذرّے ذرّے کے علم کو۔ میں نے سورۃ الانعام کی آیت شروع میں تلاوت کی تھی:

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝۵۹﴾

''اور اُسی کے پاس غیب کے سارے خزانے ہیں' کوئی نہیں جانتا اُن (خزانوں) کو سوائے اُس کے۔ اور وہ جانتا ہے جو کچھ ہے خشکی میں اور سمندر میں۔ اور نہیں گرتا کوئی ایک پتا بھی (کسی درخت سے) مگر وہ اُس کے علم میں ہوتا ہے اور نہیں (گرتا) کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں' اور نہ کوئی تر و تازہ اور نہ کوئی سوکھی چیز' مگر ایک کتابِ مبین میں (سب کی سب) موجود ہیں۔''

اللہ کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں (مفاتیح مفتاح کی جمع) جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس میں بھی مبالغہ کیا ہے۔ لَا يَعْلَمُهَآ میں ھا کی ضمیر مفاتیح کی طرف جا رہی ہے' تو مبالغہ کیا ہوا؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کنجیاں اللہ کے پاس ہیں تو اللہ کے سوا غیب کو کوئی نہیں جانتا۔ بلکہ فرمایا کہ غیب کی کنجیاں اللہ کے پاس ہیں جن کنجیوں کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا' تو غیب کو تو بالا ولیٰ کوئی نہیں جانے گا۔ یعنی اس میں مبالغہ ہے۔ یہ جزئیات کے علم کا بیان بھی ہے۔ اللہ صرف کلیات کو' بڑی بڑی چیزوں کو' اجمالی مسائل کو نہیں جانتا' بلکہ جو کچھ بر و بحر میں ہے اس کو جانتا ہے۔

خالق مخلوق کو جانتا ہے

یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم ہے۔ یعنی ہر جزو کا ہر ذرے کا وجود میں ہر شے کا علم ہے۔ اس لیے کہ: ﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۭ﴾ (الملک) ''کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا۔'' خالق وہ ہوتا ہے جو اپنی مخلوق کو جانتا ہے۔ ہم چونکہ اپنے اعمال کو تفصیلاً نہیں جانتے لہٰذا ہم اپنے اعمال کے خالق نہیں ہیں۔ خالق وہ ہے جو اپنی مخلوق کی ہر ہر شے کو جانتا ہے۔ اسی طرح فرمایا:

﴿اِنَّمَآ اِلٰـهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝۹۸﴾ (طٰہٰ)

''حقیقت میں تمہارا معبود تو صرف اللہ ہے' جس کے سوا کوئی اور معبود ہے ہی نہیں۔ اُسے ہر چیز کا علم حاصل ہے۔''

اب یہاں كُلَّ شَيْءٍ ہے۔ اسی لیے علماء نے کہا کہ قرآن مجید کی چند وہ آیتیں جو اپنے عموم پر ہیں اور ان میں کسی قسم کی کوئی تخصیص نہیں ہے ان میں ایک آیت ہے: اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۔ بکل شیء میں واقعی کل شیء ہے' اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ میں ایک رائے کے مطابق کچھ تخصیص ہے کہ شیء کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں ہوتا' لیکن بِكُلِّ شَيْءٍ میں' چاہے وہ ممکنات ہو یا مستحیلات ہوں' واجبات ہوں سب شامل ہیں۔ اور یہ علم اپنی حقیقت اور اپنی ماہیت میں مخلوق کے علم کی مانند نہیں ہے۔ مخلوق کا علم کچھ حدود میں ہے اور کچھ تصورات کے ساتھ ہے۔ اگلی آیت بہت زبردست ہے اور بہت اُمید دلانے والی بھی ہے۔ فرمایا: ﴿ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ

رَّحْمَةً وَّعِلْمًا﴾ (غافر:۷) ’’اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔‘‘ یہ فرشتوں کی دعا ہے۔ وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! تو نے ہر شے کا احاطہ کیا ہے علم اور رحمت کے ساتھ۔ اس سے ایک اور بات یہ معلوم ہوئی کہ جو شے اللہ نے پیدا کی ہے‘ جس کو اللہ جانتا ہے وہ شے مرحوم بھی ہے‘ اس پر اللہ کی رحمت بھی ہے۔ یہ اللہ کی رحمت عمومی ہے۔ اب رحمت اور علم کا آپس میں جو تعلق ہے اس کو سمجھ لیں۔ امام بیہقیؒ نے علم کے بیان میں حضرت خضر والی حدیث پوری تفصیلاً ذکر کی ہے۔ اس میں استشہاد یہ کیا گیا کہ چڑیا نے آ کر اپنی چونچ میں جو پانی لیا تو حضرت خضر نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ میرے اور تمہارے علم کی مثال اللہ کے علم میں وہی ہے جتنا پانی اس چڑیا نے سمندر سے اپنے چونچ میں لے لیا۔ یہ مثال بھی اصلاً تقریب کے لیے ہے ورنہ تو محدود (finite) اور لامحدود (infinite) میں کوئی نسبت ہی نہیں ہو سکتی۔ چڑیا نے جتنا پانی لیا اس کی کوئی نہ کوئی نسبت بن جائے گی سمندر کے ساتھ۔ لیکن یہ بہرحال سمجھانے کے لیے ہے۔ حالانکہ وہ اپنے زمانے کے دو ’’أعلم الناس‘‘ تھے یعنی حضرت خضر اور حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ ہم ویسے خِضر کہتے ہیں لیکن علماء نے کہا کہ صحیح تلفظ خَضِر ہے۔ یعنی خ پر زبر اور ض کے نیچے کسرہ ہے۔ بہرحال حضرت خضر کو بھی اللہ نے فرمایا: ﴿وَاٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴿۶۵﴾﴾ (الکہف) کہ ہم نے انہیں اپنی جناب سے رحمت اور اپنی جناب سے علم عطا فرمایا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات میں بھی ہے کہ وہ ہر شے کا احاطہ علم اور رحمت کے ساتھ کرتا ہے۔

ازدیادِ علم ازدیادِ حلم و رحمت کا باعث ہے

بعض علماء جیسے امام غزالیؒ اور دوسرے اکابر نے اس طرح بیان کیا کہ جس طرح ہم نے کہا کہ علم کے ساتھ ساتھ تواضع بڑھنی چاہیے‘ اسی طرح علم کے ساتھ ساتھ رحمت بھی بڑھنی چاہیے۔ لوگوں کے عذر دیکھنے کا مزاج پیدا ہونا چاہیے۔ جب تک حسنِ ظن کی گنجائش ہے اور جب تک کوئی عذر نکل سکتا ہے وہ عذر تلاش کرنا چاہیے۔ تو علم کے ساتھ حلم ہے۔ جو علم میں بڑھے گا وہ حلم میں بھی بڑھے گا۔ اگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ کوئی علم میں بڑھ رہا ہے اور اس کا مزاج سخت سے سخت اور حقارت آمیز ہوتا چلا جا رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کچھ مسائل ہیں۔ یعنی مزاج میں مسائل ہیں یا علم میں کچھ مسائل ہیں۔ بہرحال علم کے ساتھ اسی نسبت تناسب کے ساتھ رحمت بھی بڑھے گی اور تواضع بھی بڑھے گی۔ ایک عالم نے بہت زبردست بات کی کہ اگر مجھے کچھ زعم ہو جائے کہ میرے پاس کچھ علم ہے اور میرے خیال میں آپ جاہل ہوں‘ تو آپ مجھ سے بات کریں گے تو مجھے غصہ آ جائے گا کہ نہ اسے کچھ پتا ہے اور مجھ سے بات کرنے آ گیا‘ اسے چاہیے کہ کچھ علوم پہلے سیکھ لے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ’’العالم‘‘ ہے لیکن فرشتوں نے کچھ سوال پوچھے تو اس کے جواب میں یہ نہیں کہا کہ تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟ یہاں تک کہ شیطان اللہ سے مکالمہ کر رہا ہے کہ آپ نے اس کو سجدہ کرنے کے لیے مجھے کیوں کہہ دیا جب کہ میں تو اس سے بہتر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے العالم ہو کر سامنے والے ابلیس سے پوچھا کہ تم نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ ہمارے سامنے جو ہوتا ہے وہ ابلیس تو نہیں ہوتا۔ یہاں حلم کا اعلیٰ ترین درجہ آپ دیکھ سکتے ہیں۔ حالانکہ اللہ چاہتا تو اسی وقت ابلیس کو اٹھا کر جہنم میں پھینک سکتا تھا‘ اس کا اختیار سب کچھ ہے۔ لیکن پھر بھی اللہ نے پوچھا کہ کیا وجہ بنی؟ اس نے جواب دیا۔ پھر اللہ نے اس کا جواب دیا۔ اس نے مہلت

مانگی۔ اللہ نے کہا کہ مہلت بھی دے دیتے ہیں۔ اس نے پھر دعویٰ کیا۔ اللہ نے یہ نہیں کہا تم دعویٰ کرنے والے کون ہوتے ہو؟ بلکہ کہا کہ ٹھیک ہے تم نے دعویٰ کیا ہے کہ بہکا دوں گا' لیکن میرے فلاں بندوں کو تم بہکا نہیں سکو گے۔ بہرحال اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم ہے' رحمت بھی ہے اور حلم بھی ہے۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ جو اللہ کے جتنا قریب ہوگا اس میں بھی اسی نسبت سے حلم و تواضع بڑھنی چاہیے۔ اور اگر یہ نہیں بڑھ رہی تو جان لینا چاہیے کہ کچھ مسائل ہیں۔ اسی طرح آگے فرمایا:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۭ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ڏ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ⑫﴾ (الطلاق)

''اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے ہیں اور زمین میں سے بھی انہی کی مانند۔ ان کے درمیان (اللہ کا) امر نازل ہوتا ہے تاکہ تم یقین رکھو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ اللہ نے اپنے علم سے ہر شے کا احاطہ کیا ہوا ہے۔''

یہاں دو صفات جاننے کا کہا ہے: علم اور قدرت۔ اور یہ علم اور قدرت ہی ہے جس سے اللہ تعالیٰ قیامت میں دوبارہ جی اٹھنے پر استدلال فرماتے ہیں۔ وہ دو صفات ہیں: ﴿لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ڏ﴾ تاکہ تم جانو کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ دوسری صفت ہے: ﴿وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ تو علم شامل اور قدرتِ شاملہ کی معرفت حاصل کرو۔ ہم نے یہ کائنات بھی تمہارے لیے بنائی ہے تاکہ تم اسے دیکھ کر اللہ کے علم شامل اور اللہ کی قدرتِ شاملہ پر دلیل پکڑو اور اللہ کے قریب ہو جاؤ۔ تو یہ علم اور قدرت کا بیان ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں ہے کہ یہ پوچھتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی؟ تو جواب میں کہا گیا: ﴿اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (الملک: ٢٦) تو جواب عام ہے۔ یعنی قیامت کا علم پوچھا تھا تو کہا جا سکتا تھا: اِنَّمَا عِلْمُهٗ عِنْدَ اللّٰهِ۔ جیسے کہ دوسری جگہ پر آیا بھی ہے۔ لیکن جواب دیا گیا کہ صرف قیامت کا نہیں ہر قسم کا علم اللہ ہی کے پاس ہے۔

مختلف اسمائے حسنیٰ کا بیان جو علم پر دلالت کرتے ہیں

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے جو اسمائے حسنیٰ آتے ہیں علم پر دلالت کرنے کے لیے وہ مختلف ہیں۔ وہ علیم ہے: اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ علام ہے: عَلَّامُ الْغُيُوْبِ۔

الخبیر: اللہ جانتا ہے۔ اس کو بیان کرتے ہیں: ویختص به ان يعلم مايكون قبل ان يكون۔ کہ اصلاً خبیر اس کو کہتے ہیں کہ جو کسی شے کے ہونے سے پہلے جان لے کہ وہ شے ہو جائے گی۔ تو یہ سابقہ علم ہے۔ پھر الحکیم کے بارے میں کہتے ہیں: الحکیم: حکیم وہ ہے جو صرف ظاہری چیزوں کو نہ جانے دقائق کو بھی جانے۔ اوصاف: وصف کی جمع۔ پھر کہتے ہیں:

الشہید: یہ بھی اللہ کے علم پر دلالت کرتا ہے۔ شہید اس کو کہتے ہیں جو غیب اور حاضر دونوں کو جانے۔ اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اس سے کوئی شے غائب نہیں ہوتی۔ یہ معنی نہیں ہے کہ اللہ سے کچھ غیب میں ہے اور اللہ کے سامنے کچھ حاضر ہے تو اللہ دونوں کو جانتا ہے۔ وہ غائب اور حاضر ہماری نسبت سے ہے تو اللہ کی نسبت سے شہید کا معنی کیا بنے گا: لَا يَغِيْبُ عَنْهُ شَيْءٌ۔ اس سے کوئی شے غائب نہیں ہوتی۔ الحافظ: حافظ کا ایک معنی ہے حفاظت کرنے والا۔ ایک معنی ہے علوم کی حفاظت کرنے والا۔ یعنی ہر علم کو اپنے پاس رکھنے والا۔ حافظ وہ ہوتا ہے جو جان لے' اس کو کبھی

بھولتا نہیں۔ اس کی دلیل دیتے ہیں کہ فرعون نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مباحثے میں راہِ حق سے ہٹانے کی کوشش کی تو اس نے پوچھا: پرانے لوگوں کا کیا ہوگا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

﴿قَالَ عِلۡمُهَا عِندَ رَبِّي فِي كِتَٰبٖۖ لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى ۝٥٢﴾ (طٰہٰ)

''موسیٰ نے کہا کہ ان کا علم میرے رب کے پاس ایک کتاب میں موجود ہے۔ میرا ربّ نہ تو بھٹکتا ہے اور نہ ہی بھولتا ہے۔''

پھر کہتے ہیں: المحصی: احصاء کرنے والا' شمار کرنے والا۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ معلومات کی کثرت اسے علم سے نہیں روکتی۔ سب کا احصاء کرنے والا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

﴿أَلَا يَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ وَهُوَ ٱللَّطِيفُ ٱلۡخَبِيرُ ۝١٤﴾ (الملک)

''کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟ اور وہ بہت باریک بین ہے' ہر شے کی خبر رکھنے والا ہے۔''

پھر وہ لطیف ہے باریک اشیاء کا جاننے والا' خبیر ہے ہر شے کو پہلے سے جاننے والا ہے یا جلائل الامور بڑے بڑے امور کو جاننے والا ہے۔ اس کے بعد وہ احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔ اس کو ہم آئندہ دیکھیں گے۔ اس میں مشہور حدیث دعائے استخارہ والی ہے۔ اس میں الفاظ آتے ہیں: ((تَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ)) جس طرح قدرت کے بارے میں کہا گیا: ((فَإِنَّکَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ)) اسی طرح کہا گیا: ((وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ))

صفت علم کی تعریف

اب آخری بات' صفت علم کی تعریف کیا ہے۔ یعنی صفت علم سے ہوتا کیا ہے؟ علماء نے کہا: صفة قديمة وجودية ثابتة لذات الله سبحانه و تعالىٰ تنكشف به العلوم كلها انكشافا تاما وہ علم جو صفت وجودی ہے' قدیم ہے' اللہ کی ذات کے لیے ثابت ہے جس کے ذریعے تمام علوم مکمل طور پر منکشف ہوجاتے ہیں' جس میں کسی قسم کا کوئی اخفاء نہیں ہوتا' کوئی جہل نہیں ہوتا۔ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم کی تعریف ہے۔ ہم نے دیکھا کہ قدرت اور ارادہ کا تعلق ممکنات سے ہے۔ یعنی ایک واجب ہوتا ہے وہ تو اللہ کی ذات ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات تو کامل اور مکمل ہے۔ جو شے ممتنع ہوتی ہے' جو ناممکن ہے' جس سے عقلی استحالہ لازم آتا ہے وہ ہو ہی نہیں سکتی' وہ شے ہی نہیں ہوتی۔ لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم تمام چیزوں سے متعلق ہے۔ یعنی اللہ کا علم متعلق واجبات سے بھی ہے' کیونکہ اپنی ذات کو اللہ سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا' بلکہ اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ پھر اللہ کا علم تمام ممکنات کے بارے میں بھی ہے جو اس نے پیدا کیں اور وہ ممکنات کہ جو لامحدود ہیں جن کو پیدا کیا جاسکتا تھا لیکن ابھی پیدا نہیں ہوئیں یا نہیں ہوں گی' کیونکہ اللہ کا ارادہ نہیں ہوا۔ ان سب کو بھی اللہ جانتا ہے کہ اگر ہوتیں تو کیا ہوتیں۔ اور یہ بھی جانتا ہے کہ جو ممکنات ہوگئیں اور اگر یہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتا یعنی ممکنات کے جتنے بھی احتمالات ہوسکتے ہیں۔ اور ممتنعات جو نہیں ہوسکتے ان سب کو بھی اللہ جانتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم علم شامل ہے' علم کامل ہے' تمام جزئیات' تمام کلیات' تمام تفاصیل' تمام اجمال' تمام ممکنات' تمام واجبات' تمام مستحیلات سے متعلق ہے۔ اس میں مزید کچھ تفصیلات ہیں کہ کس طریقے سے یہ علم انسانی علم سے مختلف ہے اور کن اعتبارات سے مختلف ہے۔ اسی لیے ہم اللہ کے لیے عارف' عاقل' فقیہہ وغیرہ کے الفاظ نہیں بولتے۔ ان تفصیلات کو اگلی نشست میں دیکھیں گے۔ ان شاء اللہ! ۞۞۞

تعارف وتبصرہ

نام کتاب : دینی مدارس اور معاشرتی رویوں میں ان کا کردار

مصنف ومولف : پروفیسر سیدہ مسعودہ شاہ

ضخامت: 706 صفحات قیمت:1500 روپے پبلشر: اعلیٰ ادب پبلیکیشنز' اردو بازار' لاہور

یہ ضخیم کتاب دراصل مصنفہ کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جس میں دینی مدارس کی اہمیت اور ضرورت بیان کی گئی ہے۔ نیز یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ ان مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والوں کا معاشرتی رویوں میں اس وقت کیا کردار ہے اور درحقیقت کیا ہونا چاہیے۔ مدارس کے انتظام میں اصلاحات بھی تجویز کی گئی ہیں۔ اس مسئلے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ مدارس کے تعلیم یافتہ اکثر مساجد کے مؤذن اور امام بن کر تنگ دستی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ان کو جدید تعلیم سے روشناس کیا جائے تاکہ وہ قرآن وحدیث کی تعلیم حاصل کر کے اچھے انسان بنیں اور ساتھ ہی عصری تعلیم حاصل کر کے معاشرے میں بااثر بنیں اور عزت حاصل کریں۔ مقالے میں اگرچہ ریسرچ کا دائرہ کوئٹہ اور اس کے مضافات تک ہی محدود کیا گیا ہے مگر پورے ملک کے دینی اداروں اور وہاں سے فارغ ہونے والے طلبہ کا حال تقریباً ایسا ہی ہے۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کی تین سے آٹھ تک فصلیں ہیں جن میں متعلقہ باب کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے۔ باب نمبر 7 میں وہ سوال نامے درج ہیں جن کو بڑی محنت کے ساتھ تیار کیا گیا ہے اور پھر بڑی کوشش اور جِدّ وجُہد سے اُن کے جوابات حاصل کیے ہیں۔ ان ہی جوابات کی روشنی میں مقالے کے عنوان کی تحقیق کے نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ کتاب میں ان حوالہ جات کی فہرست دی گئی ہے جن سے دورانِ تحقیق فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ اشاریہ اور فہرست اعلام بھی دی گئی ہیں تاکہ مطالعہ کرنے والوں کے لیے سہولت ہو۔

مصنفہ نے سو سے زیادہ کتابوں اور جریدوں کے نام درج کیے ہیں جن سے مقالے کی تیاری میں فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ان میں انگریزی کتب کے علاوہ 9 رپورٹس بھی شامل ہیں۔ آن لائن ویب سائٹس سے بھی معلومات اکٹھی کی گئی ہیں۔ اصلاحِ احوال کے لیے جو اصلاحات تجویز کی گئی ہیں' وہ محکمہ تعلیم کے ذمہ داروں کے لیے چشم کشا ہیں۔ دینی مدارس کے متعلق تحقیق کرنے والے بھی اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

کتاب کا ٹائٹل عمدہ اور جلد مضبوط ہے۔ (تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ)

نام کتاب : پیغمبر اسلام ﷺ

ترتیب و تالیف : محمد عبدالقیوم

صفحات: 700' قیمت: 4000 روپے ناشر: ضیاء القرآن پرنٹنگ پریس' لاہور

ملنے کا پتہ: فیصل الیکٹرک کمپنی' 27۔ وحدت روڈ' لاہور۔ فون: 0300-1351947

اسلام دین حق ہے اور حق کا راستہ کسی بھی دور میں پھولوں کی سیج نہیں رہا۔ حق کے راستے میں مصائب و آلام آیا ہی کرتے ہیں۔ اس کائنات کی سب سے برگزیدہ ہستیاں انبیاء و رُسل علیہم السلام ہیں۔ ہم جب ان ہستیوں کی سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا رہا۔ بہت سوں کو راہِ حق میں اپنی جانوں کا نذرانہ بھی پیش کرنا پڑا' مگر ان میں سے کسی ایک کے بھی راہِ حق سے نہ قدم ڈگمگائے' نہ ارادے کمزور پڑے اور نہ ہی نشانِ منزل ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوئی۔ ان کے لیے کوہِ استقامت کا استعارہ بہت ہلکا محسوس ہوتا ہے۔ انبیاء و رُسلؑ میں سب سے اعلیٰ و ارفع ہستی پیغمبر آخر الزماں حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ہے' راہِ حق میں جس قدر آپ ﷺ کو تنگ کیا گیا' اتنا کسی بھی پیغمبر کو نہیں ستایا گیا۔

کتاب ''پیغمبر اسلام'' نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے ان واقعات پر مشتمل ہے جو انسانی تاریخ کے سب سے عظیم انسان کو پہنچنے والی تکالیف اور مصائب و مشکلات کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ سیرت النبی ﷺ کا ایک اچھوتا موضوع ہے اور میرے علم کی حد تک یہ ایک منفرد کتاب ہے۔ مؤلف محترم محمد عبدالقیوم صاحب نے کتاب کے آغاز ہی میں ''حرفِ نیاز'' کے عنوان سے موضوع کی تصریح کر دی ہے کہ اہلِ عرب کا قول ہے:

''آج جس دُکھ یا مصیبت نے تجھے مغموم اور دل گرفتہ کر دیا ہے' اس عرصۂ غم میں تم اگر اللہ کے حبیب رسول کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں پیش آنے والے دُکھ کے لمحات اور صدمات کو یاد کرو تو تمہیں اپنی تکالیف اور غم چھوٹے نظر آئیں گے۔''

کتاب میں درج واقعات مستند' اندازِ تحریر نہایت سادہ' عام فہم اور انتہائی دل نشیں ہے۔ منتخب اشعار اور درود و سلام نے اس کتاب کو چار چاند لگا دیے ہیں' جس سے مؤلف کی پیغمبر اسلام ﷺ سے بے پناہ محبت اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ کتاب اپنی مقصدیت اور افادیت کے حوالے سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

کتاب کا سرورق دیدہ زیب' کمپوزنگ و طباعت عمدہ' کاغذ انتہائی قیمتی ہے۔ رنگین صفحات پر مشتمل یہ کتاب اسلامی تحریکات' واعظین و مربّیین' تحقیقی و تعلیمی اداروں' لائبریریوں' مکتبہ جات' ہر گھر اور ہر فرد' خاص طور پر نوجوان طلبہ و طالبات کے لیے ایک بہترین اور انمول تحفہ ہے۔ (تبصرہ نگار: احمد علی محمودی)

Those who take others as deities besides Allah *(SWT)* are destined to be destroyed. Their beliefs and their polytheistic deeds are all in vain and they do not have any foundation in Truth.

Verse 140

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۝

He said, "Is it other than Allah I should desire for you as a god while He has preferred you over the worlds?"

Prophet Moses *(AS)* chided the Children of Israel for their want to transgress and said that how could he desire any deity for worship other than Allah *(SWT)* for them when it was a clear deviation from the right path. Allah *(SWT)* had given him *(AS)* prophethood to call them to the Truth and made the Bani Israel His *(SWT)* vicegerents and granted them exaltation over all the nations of the world.

Verse 141

وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ۝

And [recall, O Children of Israel], when We saved you from the people of Pharaoh, [who were] afflicting you with the worst torment – killing your sons and keeping your women alive. And in that was a great trial from your Lord.

Prophet Moses *(AS)* told his *(AS)* people, the Children of Israel, to remember how Allah *(SWT)* had saved them from the oppression and afflictions of the Pharoah. Pharoah had subjected them to the worst form of punishment, by killing their male offspring and keeping their female offspring alive, so that they would never gain power and hence remain in his slavery and keep serving his evil desires. Indeed, it was a great trail from Allah *(SWT)*.

==================================

And Allah *(SWT)* Knows Best!

Children of Israel] said, "O Moses, make for us a god just as they have gods." He said, "Indeed, you are a people behaving ignorantly.

On their way to the Holy Land of Palestine from Egypt, at some point, the Israelites encountered a nation that was involved in idol-worshipping. Passing by these places, the people of Israel, who had been subservient to the Egyptians for a long time and were thus considerably 'Egyptianized' in their outlook, felt the desire to indulge in idol worship. This evidently showed the extent to which the Israelites had become degenerated as a result of their slavery in Egypt.

The word "يعكفون" in the verse refers to meditation in front of idols. This notion was once explained by Dr. Sarvepalli Radhakrishnan, a renowned Indian philosopher, who also served as the second President of India from 1962 to 1967. Dr. Radhakrishnan was the contemporary of the famous British philosopher and mathematician Bertrand Russel. While Burtand Russel was a logical positivist and denied everything except matter, Dr. Radhakrishnan was one of the most renowned Hindu spiritualists of that age. In his book "The Philosophy of Hinduism", Dr. Radhakrishnan described his take on the philosophy of the worship of idols. Dr. Radhakrishnan wrote that because it is difficult for people to pray to God directly, as God is unseen, Hindus place some form of visible and palpable object as a deity before them and then pray before that as a "means to approach" God. However, that convoluted ideology holds no water at all. In truth, Dr. Radhakrishnan's account was nothing more than an apology for idolatry, as the fact remains that those who pray in front of idols made of stone or some other physical and palpable object (or a non-physical deity other than Allah *SWT*) are, in fact, worshiping these idols, and making them shareholders in the Sovereignty of Allah *(SWT)*. These philosophies are deviant to the core and based on clear transgression and polytheism. They are only practiced by those ignorant of the Truth.

<u>**Verse 139**</u>

إِنَّ هَٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيهِ وَبَٰطِلٌ مَّا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ۝

Indeed, those [worshippers] – destroyed is that in which they are [engaged], and worthless is whatever they were doing."

obstinately rejected Allah's *(SWT)* signs, who were the transgressors and who paid no attention to the message of Allah *(SWT)* and His *(SWT)* messenger Moses *(AS)*, were drowned and their roots cut off.

Verse 137

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا ۖ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ
الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا ۖ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ ﴿١٣٧﴾

And We caused the people who had been oppressed to inherit the eastern regions of the land and the western ones, which We had blessed. And the good word [i.e., decree] of your Lord was fulfilled for the Children of Israel because of what they had patiently endured. And We destroyed [all] that Pharaoh and his people were producing and what they had been building.

The Bani Israel had been oppressed in Egypt probably for hundreds of years. They endured the oppression with great patience. They followed Prophet Moses *(AS)* with perseverance. Ultimately, when the decreed time arrived, the entire army and the nation of Pharoah were drowned and their roots were cut off. Allah *(SWT)* granted the Children of Israel the promised deliverance from the tyranny of Pharoah. The East and the West of the land in this verse refer to the blessed land of Palestine (The Holy Land or Al-Ard Al Muqaddas). The Israelites were made the inheritors of Palestine. The evidence in the Qur'an and Ahadith as well as historical and archaeological accounts show that the Bani Israel were eventually able to enter as victors in the Holy Land, years after the death of Prophet Moses *(AS)* and they established their kingdom in Palestine. As for Egypt, all the grand structures and buildings built by the nation of Pharoah and whatever riches they produced were all destroyed by Allah *(SWT)*.

Verse 138

وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلَىٰ قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَىٰ أَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوا يَا مُوسَى اجْعَل لَّنَا إِلَٰهًا كَمَا
لَهُمْ آلِهَةٌ ۚ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ﴿١٣٨﴾

And We took the Children of Israel across the sea; then they came upon a people intent in devotion to [some] idols of theirs. They [the

The verse elucidates that whenever hit by the plague, the arrogance of the nation of Pharoah turned into a pleading for respite. Whenever they were caught by afflictions, they would come begging to Prophet Moses*(AS)* and beseech him*(AS)* to call upon his*(AS)* Lord*(SWT)*, based on the covenant that he *(AS)* had with Him *(SWT)*, to remove the tribulation and provide them salvation. They vowed to let the Bani Israel leave with Prophet Moses *(AS)* if he *(AS)* would help them get deliverance from the affliction. It indicates that deep in their hearts, Pharoah, his courtiers and chieftains, and the rest of his nation believed that Prophet Moses*(AS)* was indeed the messenger of Allah *(SWT)*.

Verse135

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿١٣٥﴾

But when We removed the punishment from them until a term which they were to reach, then at once they broke their word.

However, as soon as Allah *(SWT)* removed their affliction, they broke their covenant with Allah *(SWT)* and his messenger Moses *(AS)*. They would refuse to honour their commitment and return to their deviant ways. The verse also shows that Allah *(SWT)* gave the nation of Pharoah respite, time and again, and they broke their promise on every occasion. Once they would go back on their word, they would be caught by another affliction. They were given many opportunities to get redemption, yet they continued to transgress and were caught by the final affliction that cut off their roots.

Verse 136

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿١٣٦﴾

So We took retribution from them, and We drowned them in the sea because they denied Our signs and were heedless of them.

Allah *(SWT)* took retribution from the nation of Pharoah. Prophet Moses *(AS)* led his people out of Egypt, on Allah's *(SWT)* command and the forces of Pharoah followed them to the sea. The entire army and the nation of Pharoah were drowned. Allah *(SWT)* saved Prophet Moses *(AS)* and his *(AS)* people. Hence, those who rejected Allah *(SWT)* and His *(SWT)* messenger Moses *(AS)* the ones who were iniquitous, who

were caught by smaller afflictions and trails so that they may wake from their devious slumber and revert to the right path.

It is clear that Pharaoh's courtiers, and following them the rest of Pharoah's nation, obstinately persisted in branding Prophet Moses's *(AS)* signs as sorcery although they knew well that sorcery had nothing in common with the miraculous signs granted to him *(AS)* by Allah *(SWT)*. Even a fool would not be ready to believe that the country-wide famine and the consistent decrease in agricultural output could have been caused by magic. They rejected those signs out of iniquity and arrogance even though they were inwardly convinced of the Truth.

<u>Verse 133</u>

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا
مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

So We sent upon them the flood and locusts and lice and frogs and blood as distinct signs, but they were arrogant and were a criminal people.

The nation of Pharoah did not mend its ways following the decline in agricultural produce and famine caused by the drought. They continued to reject the message of Allah *(SWT)*. They were caught by further divine afflictions in the form of flood, locusts, lice, frogs, and blood. These were clear signs from Allah *(SWT)* for the disbelievers to submit to Him *(SWT)* and heed the message of Prophet Moses *(AS)*. However, they were a guilty people and obstinately persisted in their disbelief due to their iniquity and arrogance.

<u>Verse 134</u>

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ
وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ﴿۱۳۴﴾

And when the punishment descended upon them, they said, "O Moses, invoke for us your Lord by what He has promised you. If you [can] remove the punishment from us, we will surely believe you, and we will send with you the Children of Israel."

And We certainly seized the people of Pharaoh with years of famine and a deficiency in fruits that perhaps they would be reminded of.

Pharaoh and his nation were seized by drought. That resulted in years of famine. There was no rain for years, so the nation of Pharoah had little or no agricultural produce. There was a severe dearth of crops and fruits. Allah *(SWT)* sends His *(SWT)* wrath as a punishment and as a sign of reminder for the nation of Pharoah so that they may repent and revert to the Truth.

Verse 131

فَإِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۝

But when good [i.e., provision] came to them, they said, "This is ours [by right]." And if a bad [condition] struck them, they saw an evil omen in Moses and those with him. Unquestionably, their fortune is with Allah, but most of them do not know.

However, the nation of Pharoah had deviated to such a degree that they were arrogant and disbelieving. Their behaviour in response to Allah's *(SWT)* signs was such that whenever something good came to them, they said, this is our entitlement. However, whenever they were hit by a calamity, they used to attribute it to the 'evil omens' of Prophet Moses *(AS)* and his*(AS)* followers. The verse also elucidates that whatever good is received or whatever harm comes is all from Allah *(SWT)*. The calamities that befall someone may be a punishment or a sign of reminder from Allah *(SWT)*. The provisions that someone gets may be a trial or a reward from Allah *(SWT)*. The truth is that nothing can occur without the permission of Allah *(SWT)*. However, most people are oblivious to this Truth.

Verse 132

وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ۝

And they said, "No matter what sign you bring us with which to bewitch us, we will not be believers in you."

According to the general rule of Allah *(SWT)*, whenever a Messenger *(AS)* was sent to a nation and they refuted and rejected him *(AS)*, they

Verse 129

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۭ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ
فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝

They said, "We have been harmed before you came to us and after you have come to us." He said, "Perhaps your Lord will destroy your enemy and grant you succession in the land and see how you will do."

The people of Prophet Moses *(AS)* said that we were being persecuted before he *(AS)* came to them and that persecution has not stopped even after his *(AS)* arrival. Bani Israel in Egypt were subject to devastating torments. Their male offspring were put to death, and the female offspring were kept alive. Prophet Moses *(AS)* said to his people that they must keep faith in Allah *(SWT)*. Allah *(SWT)* will destroy their enemy when He *(SWT)* wills. Allah *(SWT)* will make them His *(SWT)* vicegerents on earth. Allah *(SWT)* will then judge them according to their deeds.

This verse has a special significance concerning the history of the Indian subcontinent. The Muslims of the Indian subcontinent feared the Hindu majority and prayed to Allah *(SWT)* for deliverance. They promised that if Allah *(SWT)* gave them freedom from the Colonial Britishers and the Hindus, they would establish the Deen (Islam) in their independent land. Allah *(SWT)* bestowed to us Pakistan as a miracle. Now the trial of the Muslims of the nascent state of Pakistan started. We had created this country based on Islam and when we did not fulfill our promise made to Allah *(SWT)* and did not enforce the Deen (Islam) here, the wrath of Allah *(SWT)* befell us. One half of the country was truncated in 1971, after suffering a humiliating defeat at the hands of India. Almost 34,000 of our soldiers were taken prisoner by the Indian army. It was actually a punishment from Allah *(SWT)*. When a nation makes a promise to Allah *(SWT)* and breaks that promise, Allah *(SWT)* sends His *(SWT)* punishment.

Verse 130

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝

Moses*(AS)* in the box as an Israelite child and to save him persuaded her husband, the Pharoah, to take the child as their adopted son. Hence, Prophet Moses *(AS)* was raised in the house of the King. Later, Pharoah had a biological son, who grew up and turned out to be the Pharoah towards whom Prophet Moses *(AS)* brought the message of Allah *(SWT)*. Both were raised under the same roof and they were brought up like foster siblings. The Pharoah, hence, did not kill Prophet Moses *(AS)* and his followers but reinstated the ordinance of his father, whereby any male offspring born to an Israeli woman was killed. Therefore, there were two periods of persecution. The first period took place before Prophet Moses's *(AS)* birth, whereas the second period of persecution started after Prophet Moses's *(AS)* assumption of the office of prophethood. Common to both periods is the killing of the male issue of Israelites while the female was spared. It was a calculated design to rob the Israelites of their identity, reduce their numbers and bring about their forcible assimilation, thus nipping the 'evil' in the bud.

Verse 128

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

Said Moses to his people, "Seek help through Allah and be patient. Indeed, the earth belongs to Allah. He causes to inherit it whom He wills of His servants. And the [best] outcome is for the righteous."

The Persecution of Bani Israel in Egypt was a great trial for the followers of Prophet Moses *(AS)*. Prophet Moses *(AS)* directed his people to seek the help of Allah *(SWT)*. He *(AS)* told them to have patience. Allah *(SWT)* tests His *(SWT)* servants with trials. Indeed, those who are successful are rewarded by Allah *(SWT)*. Prophet Moses *(AS)* told his *(AS)* people that the earth and its dominion belong to Allah *(SWT)* alone and He *(SWT)* bestows the inheritance of the land and its dominion to whoever He *(SWT)* wills. Pharoah and his nation may have respite but only until the time decreed by Allah *(SWT)*. Surely, the final victory is for those who have true faith and who have Taqwa (fear of Allah *SWT*), and they will be successful in the Hereafter.

Exposition of verses 127 – 141 of Surah Al-A'raf

Verse 127

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ ۚ قَالَ سَنُقَتِّلُ
أَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ﴿١٢٧﴾

And the eminent among the people of Pharaoh said, "Will you leave Moses and his people to cause corruption in the land and abandon you and your gods?" [Pharaoh] said, "We will kill their sons and keep their women alive; and indeed, we are subjugators over them."

When the magicians and sorcerers, and their benefactors including Pharoah and his chieftains and courtiers, had been defeated, and the truth established before the whole crowd, the chieftains and courtiers of Pharoah said to him that would he allow Prophet Moses *(AS)* and his followers to make mischief in the land, by denying him as 'the sovereign god' and the other deities, including the sun god, that they primarily worshipped. History is a testament to the fact that when a new ideology that is robust in its essence is introduced in a decaying civilization, it becomes a great threat to the status quo and may lead to a potential civil war. Thus, they counseled Pharoah to take stern action against the Muslims.

It must be noted that according to historians, this particular Pharoah, had been very close to Prophet Moses *(AS)* since early childhood, as he was there when Prophet Moses *(AS)* arrived in the palace of the Pharoah in his infancy. When Prophet Moses *(AS)* was born, the ordinance passed by the Pharoah was in place that any male child born to an Israeli woman must be put to death. The mother of Prophet Moses *(AS)* knew that with the birth of a son, the King's people will come, take away the child and kill him. Allah *(SWT)* inspired her to put the infant in a box and cast that box in the river Nile to save him and that he shall be reunited with his mother, in due course (Al- Qasas,28: 7-13).The current of the river Nile took the box to the palace of the Pharoah. The Pharoah of that time was the father of the Pharoah to whom Prophet Moses *(AS)* was later sent with the message of Allah *(SWT)*. Exegeses of the Quran say that the Pharoah was issueless. His wife was from Bani Israel. She recognized the infant Prophet

Moses *(AS)* came forth with his call. This caused the chieftains and courtiers of Pharoah to panic. They sought to buy time and made a mischievous plan.

Hence, they dubbed Prophet Moses *(AS)* a sorcerer to refute his claim to prophethood. Professional magicians and sorcerers were amassed from all over the land to challenge Prophet Moses *(AS)*. Pharoah gave the magicians his blessings and promised them positions of great authority and status. The 'competition' began. The magicians and sorcerers started their magic, which bewitched the people's sight as all their ropes, strings and other items appeared to be snakes running wildly on the ground. Allah *(SWT)* revealed unto Prophet Moses*(AS)* to throw his staff and it started swallowing all the falsehood that the magicians had conjured up. Thus, the truth was established before the whole crowd. The magicians and sorcerers, and their benefactors including Pharoah and his chieftains and courtiers, were all proven false. The magicians and sorcerers all fell into prostration and declared that they had come to believe in The Lord *(SWT)* of the worlds, The Lord *(SWT)* of Prophets Moses *(AS)* and Haroon *(AS)*. Pharoah was a tyrant and a false claimant to godhead. He was livid with the adverse outcome of his plan and arrogantly chided the magicians, who had now become Muslim, for coming to believe in an entity besides himself. He cunningly tried to make it a conspiracy hatched between them and Prophet Moses *(AS)* to rob him of his dominion and authority over Egypt and a plot to expel him from the city. He ordered the harshest punishment for the magicians who turned Muslims by decreeing that their hands and feet be cut in the opposite directions. He then ordered them to be crucified. Pharaoh then gave up all pretence to follow truth and justice and brazenly resorted to persecution instead. The sorcerers turned Muslims prayed to Allah *(SWT)* for patience and forbearance in that hour of trial and beseeched Allah's *(SWT)* help to remain steadfast and die as Muslims. When true faith illumined their hearts, they displayed such resoluteness of will and love for the truth that they contemptuously turned down Pharaoh's offer.

==

Recap of verses 100 – 126 (inclusive) of Surah 7, Al-A'raf

Verses 100 through 102 enunciate that those people who derive no lesson from history, who thoughtlessly pass over the ruins of the past, remaining engrossed in heedlessness, are deprived by Allah *(SWT)* of the capacity to think correctly and to pay due attention to the counsel of well-wishers. That, in the Qur'anic terminology, is called a seal on the heart. It is further elucidated that most human beings are not faithful to the primordial covenant which they made with Allah *(SWT)* which is binding on every mortal as Allah's *(SWT)* servant and creature. Moreover, most of the human beings are not faithful to the collective covenant which is binding on every human being as a member of the human fraternity. Nor are men generally faithful to the commitments which they make to Allah *(SWT)* in hours of distress or in moments when their moral instincts are awake and astir. Violation of any of these covenants has been termed fisq (transgression). The stories narrated in the Qur'an bring home unmistakably the point that people who reject Allah's *(SWT)* Message are not spared; rather they are destroyed.

Starting from verse 103 of the Surah, an extensive discourse related to an important chapter in the history of Bani Israel and the enormous battle of Prophet Moses *(AS)*, along with his brother Haroon*(AS)* and the believers against Pharoah is provided. Prophet Moses*(AS)* was sent to Pharaoh to invite him (give dawah) to two things; first, to surrender himself to Allah *(SWT)* (i.e. Islam); and second, to release the Israelites - who were already Muslims - from his oppressive bondage. Prophet Moses *(AS)* was granted two miraculous signs to provide testimony to his being a Messenger of Allah, the creator and sovereign of the universe. When he threw down his staff, it became a serpent – manifest and clear. When he drew forth his hand from his bosom, it was white (radiant) for all the beholders. The fact is that Prophet Moses's *(AS)* claim to prophethood implied the call to total change, obviously, including political change. For if a person claims to be Allah's *(SWT)* Messenger, it implies that people obey him unreservedly. It is this which explains why Pharaoh and his coterie felt threatened by an all-out revolution - political, economic, and social - when Prophet

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr.Israr Ahmad

Surah Al-A'raf

(The Heights)

(Recap of verses 100 – 126 of Surah,7, Al-A'raf, and exposition of Verses 127 – 141 of the same Surah, inclusive)

Translator's note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Verse) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQuran.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.